www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اگست 2022

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب کا خانہ

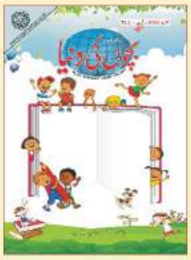

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

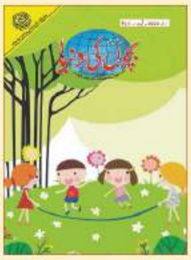

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 6 شمارہ: 8 اگست 2022

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64
■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	حجاب امتیاز علی تاج کی فکشن نگاری	شگفتہ پروین	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		12
تحریک آزادی	ام الاحرار و مجاہد آزادی: بی اماں	ڈاکٹر راشد میاں	13
	مجاہد آزادی حسرت موہانی	خوشنما	16
جہان نسواں	شہر بانو بیگم کی خود نوشت 'بیتی کہانی'	ضیاء الرحمٰن	21
	شیفتہ شخصیت اور فن	نازیہ حسن	25
	علی عباس حسینی کی تنقیدی بصیرت	عافیہ نگار	28
اعتراف ہنر	سردار خانم مخفی امروہوی	ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی	33
	نادیدہ بہاروں کے نشاں	پروفیسر اسلم جمشید پوری	37
حسن سخن	سیدہ نسرین نقاش، ڈاکٹر ہاجرہ خاتون، سیدہ تبسم منظور ناڈکر		40
افسانہ	چہرہ	ڈاکٹر زیبا ناز	43
	سائبان	صاحبہ فردوس	46
	یک طرفہ محبت	روبینہ ساگر روبی	49
باورچی خانہ			55
صحت	غذا کی صفائی اور تحفظ	شکیل احمد	57
آرائش و زیبائش			60
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		62

مشعل

ایسی بہت سی خواتین گزری ہیں جن کا نام جنگ آزادی اور جدو جہد آزادی میں سرگرم رکن کے طور پر ابھرتا ہے۔خواتین نے جنگ آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے تحریک آزادی کے لیے نہ صرف جدو جہد کی بلکہ عملی طور پر بھی وہ پیش پیش رہیں اور عوام میں جنگ آزادی میں حصہ لینے کی تحریک پیدا کی، آزادی کے جذبے کو گرمایا اور ملک کے تئیں خواتین کو بیدار کرنے میں مثبت رول ادا کیا۔

چاہے آزادی کی لڑائی ہو یا دوسرا معاملہ خواتین ہر جگہ سرگرم عمل رہیں۔آزادی کے متوالوں میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ان میں ہر مذہب کی خواتین شامل تھیں۔ پردہ پوش عورتوں میں رانیاں، بیگمات اور عام خواتین تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ تو وہ کسی اخبار کی سرخی بنیں اور نہ ہی کسی نے ان کے کارناموں کو عوام کے سامنے پیش کیا اس کے برخلاف وہ بے نشان رہیں اور پوری عرق ریزی سے اپنے مقصد میں ہمہ تن مصروف رہیں۔

بیگم حضرت محل کا نام جنگ آزادی کے حوالے سے قابل قدر ہے۔وہ جنگ آزادی میں اولین سرگرم عمل خاتون رہیں۔ برطانوی سامراج و ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف بغاوت کی اور انگریزوں کے خلاف عمل پیرا ہوئیں۔انھوں نے جنگ آزادی میں مکمل طور پر اپنے جوہر دکھائے اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنیاد پر جنگ آزادی میں مسلم قائد کے طور پر ابھریں۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ہند میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہوئیں۔بیگم حضرت محل کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی خواتین کے نام آزادی کے حوالے سے سامنے آئے۔ بی اماں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ رہائی کے بعد بھی وہ آزادی کی لڑائی میں بہت فعال رہیں۔انھوں نے ستیہ گرہ اور خلافت فنڈ کے لیے روپیہ جمع کیا۔اسی طرح نشاط النساء بیگم نے بھی بہت سی صعوبتوں کو برداشت کیا۔وہ تحریک آزادی کی فعال رکن بن کر ابھریں۔انھوں نے مولانا حسرت موہانی کی قید و بند کی صعوبتوں کے دوران ان کے مقدمے کی پیروی کی اور اپنے شوہر کے ساتھ ہر جلسے میں شامل رہیں اور علی گڑھ میں خلافت تحریک کے قیام میں بھی انھوں نے عملی طور پر حصہ لیا۔مولانا حسرت موہانی نے آپ بیتی 'مشاہدات زنداں' میں لکھا ہے کہ اپنے رسالے 'اردو معلیٰ' میں مضمون شائع کرنے کی پاداش میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور ان کو قید بامشقت سنائی گئی۔زلیخا بیگم مولانا ابوالکلام آزاد کی زوجہ تھیں۔ بہت سے مصائب برداشت کرنے کے باوجود وہ اپنے شوہر کی نگراں بنی رہیں۔ان تمام خواتین نے تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا اور اپنے مقصد کے تئیں ہمیشہ عمل پیرا رہیں۔

تحریک آزادی میں خواتین کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ان کی خدمات قابل قدر اور نمایاں ہیں۔خواتین نے پردے میں رہ کر ملک کی جو خدمت کی ہے اس کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے۔ کیونکہ خواتین کی ترقی کے بغیر معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شگفتہ پروین

حجاب امتیازِ علی تاج کی فکشن نگاری

حجاب اسمٰعیل 1915 میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں اور شادی 1935 میں شہرت یافتہ ڈرامہ نگار اور مشہور ڈرامہ، انارکلی، کے مصنف سید امتیاز علی تاج سے ہوئی۔ اس مناسبت سے ادبی حلقے میں حجاب امتیاز علی تاج کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ حجاب کا تخیلی اور تخلیقی ذہن نے جس دبستان فکر کو موضوع بنایا وہ رومانی دبستان ہے۔ وہ سجاد حیدر یلدرم کے تخلیقی حسن سے بے حد متاثر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے موئے قلم کو حسن و عشق کا گرویدہ بنایا اور رومانی دبستان فکر کو ایک ایسے حسن سے متعارف کرایا جہاں احساس و جذبات کی فراوانی حسن و عشق سے اوپر اٹھ کر حیرت و استعجاب، خوف و دہشت جیسے وحشت ناک منظر کو سمیٹتے ہوئے قاری پر رومانی اثرات قائم کرتے ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول ان کے تخیلی ذہن کے عمدہ نمونہ ہیں۔ حجاب ایک خط میں اپنے تخلیقی ذہن سے متعلق تحریر کرتی ہیں:

''میں سدا کی ایک خواب کار عورت ہوں۔ خواب کاروں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ سخت فراری ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں پرانی اور مشاق فراری ہوں۔ فراریوں پر الزام ہے کہ وہ بزدل ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں بزدل ہوں۔ شدید حقیقت کی دہشت انگیزی کا مقابلہ نہیں کرسکتی یہی وجہ ہے کہ خوف زدہ ہوکر میں نے خوابوں کے پرسکون جزیروں میں پناہ لی اور وہاں تمام عمر کہانیاں لکھنے میں بسر کردی۔''

(ڈاکٹر مجیب احمد خان، امتیاز علی تاج فن اور شخصیت، عفیف پرنٹرس، دہلی، سن2000 صفحہ 48,47)

حجاب امتیاز علی افسانونی ادب کی تاریخ میں پہلی اور آخری رومانی فکشن نگار خواتین کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ ہر صنف پر طبع آزمائی کی اور اس میں نت نئے پھول کھلائے۔ عمیق مطالعہ اور تخیل کی بلند پروازی کے باعث ان کے ناول اور افسانے رومانی دبستان فکر میں منفرد مقام قائم کیا۔ حجاب کا پہلا افسانہ ''میری ناتمام محبت'' ہے جو بعد میں اسی نام سے مجموعے کی شکل میں شائع ہوا۔ ان کے دیگر مجموعوں میں کالی حویلی اور دوسری خوف ناک کہانیاں، لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے، صنوبر کے سائے، وہ بہاریں یہ خزائیں اور تحفے اور دوسرے شگفتہ افسانے شامل ہیں اور ناولوں میں اندھیرا خواب، ظالم محبت، اور پاگل خانہ ادبی سرمایے میں بے حد

اہمیت کے حامل ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ''میری ناتمام محبت'' ان کا سب سے پہلا افسانہ ہے جو نیرنگ خیال، جنوری 1932 میں قسط وار شائع ہوا۔ ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں لکھا ہوا یہ افسانہ زبان وبیان اور فکر وفن کے ساتھ عشق کی دلفریب جذبات سے مزین ہے۔ مصنفہ نے اس افسانے سے متعلق لکھا ہے کہ:

> ''چنانچہ میری ناتمام محبت ایک ناتجربہ کار لڑکی کے نابالغ ذہن کا تراشیدہ ایک ایسا بت ہے، جس کی ساخت میں کئی جگہ خود بت تراش کی نوعمری اور جذبات کی ولولہ انگیز ناہمواری جھلکتی نظر آتی ہے یا یوں سمجھئے کہ کہیں اس بت کی آنکھیں بہت زیادہ نشیلی ہوگئی ہیں تو کہیں ابرو بے حد خم دار ہو گئے ہیں۔ آج میں اپنی اس کتاب کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیتی ہوں اور پرانی یادیں نہ جانے مجھے کس خیالستان میں لے اڑتی ہیں۔'' (ایضاً، صفحہ 71)

افسانہ ''میری ناتمام محبت'' کے مطالعے کے بعد قاری حجاب کے اس کم سن عمر کی تحریر پر حیرت کا ضرور شکار ہوتا ہے اور اس کا ذہن ان کے حقیقی محبت کی داستان سمجھ بیٹھتا ہے لیکن مصنفہ کی ساڑھے گیارہ سال کی عمر قاری کے ذہن کو حقیقی داستان سے ہٹا کر تخیلی دنیا کی طرف موڑنے میں کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ مذکورہ افسانہ مرکزی کردار روحی، کیپٹن فکری، دادی زبیدہ اور روحی کے والد کے بحث اور اخلاقی اقدار کے ذریعہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ جہاں یہ افسانہ پلاٹ اور کردار کا عمدہ شاہکار ہے تو دوسری طرف رومانی خیالات کی بھرپور تردید بھی کرتا ہے۔ تخلیق کار قاری کو اس حقیقت سے متعارف کرانا چاہتا ہے کہ محبت کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ روحی اپنی دادی جو ایک مغرور اور خود پسند رئیسہ ہیں ان کے زیر سایہ رہتے ہوئے امیر وکبیر نوجوان شہباز سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور افسانے میں کلائمکس اس وقت آتا ہے جب وہ 38-39 سال کے کیپٹن فکری کے مشفقانہ رویے کے باوجود اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیتی ہے۔ ان دونوں کی بے جوڑ محبت کو حجاب آپسی بحث کے ذریعے کچھ یوں ابھارتی ہیں:

> ''مگر جناب میں یقیناً بوڑھا نہیں ہوں۔''
> میرے والد اب تک حیران تھے۔ ان کی آواز مین کپکپی تھی۔ کہنے لگے ''نہیں آپ کو بوڑھا کون کہے گا بھلا؟ انتالیس یا چالیس سال کا مرد بوڑھا نہیں کہلایا جاسکتا ہے۔ مگر..... روحی کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے 39 سال بہت زیادہ ہیں پیارے کیپٹن! ذرا غور تو کرو۔''.... ''مگر..... میری سمجھ میں نہیں آتا۔ عزیز من! تم نے آخر کیا سوچ کر روحی جتنی لڑکی سے..... محبت کی ہے۔؟'' آہ! محبت کیا سوچ سمجھ کر ہوتی ہے؟'' میرے دل نے نعرہ بلند کیا۔ میرے والد نے تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی سوال کیا۔'' آخر تم دونوں نے کیا سوچ کر ایک دوسرے سے اقرار محبت کیا'' فکری مطمئن لہجے میں کہنے لگے۔ ''مجھے آپ کی لڑکی سے محبت ہے۔ میں نے بچپن سے اس کی تعلیم وتربیت میں دلچسپی لی۔ جناب کیا میں اس معاملے میں آپ سے نیک توقعات رکھ سکتا ہوں۔''

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، مکتبہ جامعہ دہلی، 1982، صفحہ 155,56)

حجاب ناکام محبت کے غمگین پیرائے کو اس خوبصورتی سے تحریر کرتی ہیں کہ ہر ایک لفظ رومان کی پر کیف ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کا اختتام رنج وغم کے ان جذبات کے ساتھ ہوتا ہے۔

> ''دفعتاً انھوں نے میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لی اور کہنے لگے'' آہ برسوں اس چھوٹی سی سفید انگلی میں عقد کی انگشتری ہوگی۔'' کبھی نہیں..... میں نے جواب دیا'' کبھی نہیں!''
> یہ تو ناممکن ہے! روحی اب تم انکار نہیں کرسکوگی!'' مگر واقعات انکار کر دیں گے۔''!
> دیکھو روحی! ایسی باتیں نہ کرو! میں بھی کیسا بے وقوف ہوگیا ہوں۔ میرے لیے مناسب نہیں کہ تمہیں رنجیدہ کروں آؤ..
> روحی! آؤ اب ہم ایک دوسرے کو سچے دوستوں کی طرح الوداع کہیں.....
> مگر نہیں روحی! میرا ارادہ مستقل ہے! مجھ سے تم کو اور تمہیں مجھ سے جدا ہونا ہی ہے مجھے خبر نہیں کہ پھر ہماری ملاقات کس دنیا میں ہوگی۔ لو خدا حافظ!'' (ایضاً، صفحہ 166)

حجاب کا یہ افسانہ رومانی دبستان کا شاہکار ہے۔ ان کے دیگر افسانوں میں بھی معصومیت اور خلوص بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی تحریروں میں محبت اپنی سادگی کے ساتھ، معشوق اپنی شگفتگی کے ماحول میں اپنی رنگینی کے ساتھ قوس وقزح کا رنگ بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی محبت اگرچہ ماورائی ماحول کی پروردہ ہے مگر اس کے باوجود یہ محبت زندگی کی حقیقت سے دور نہیں اور کبھی کبھی قاری یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ رومانیت کی شعریت میں زندگی کی تلخ حقیقت بھی کہیں چھپی ہوئی نظر

آرہی ہے۔اس نوع کے افسانوں میں ان کا دوسرا اہم افسانہ ''صنوبر کے سائے'' ہے۔یہ افسانہ بھی حجاب کے دوسرے افسانوں کی طرح رنج والم کے پلاٹ کے ذریعے تخلیق پاتا ہے۔تخلیق کار اس جانب اشارہ کرتی ہیں کہ زندگی کے اس پُر پیچ ماحول میں کسی مسئلے سے متعلق جلد بازی کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ غوروخوض ضروری ہے۔حقیقت کی تہہ تک پہنچ کر فیصلہ صادر کرنا بہتر ہوتا ہے۔افسانہ ''صنوبر کے سائے'' میں ملاح کی افسوس ناک زندگی اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے جو اپنی حسین اور پھول جیسی مسکراتی زندگی کو غلط فہمی کے باعث چند لمحوں میں اپنے ہی ہاتھوں خون کردیتا ہے۔

افسانہ ''صنوبر کے سائے'' کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے۔کہانی ساحل ''نہر روحناک'' کی سیر کی خواہش سے شروع ہوتی ہے۔جہاں ایک سو سالہ ملاح ستر سال سے کشتی چلاتا ہے۔روحی اور جسوتی اس کے کشتی پر سوار ہیں اور بوڑھا ملاح رومان سے لبریز اپنا المیہ بیان کرتا ہے۔جس کو صنوبر کے سایوں سے بے پناہ عشق ہے اور وہی اس کا بسیرا بھی ہے۔کیونکہ اسی سایے تلے اس کا عشق پروان چڑھا تھا جسے وہ شریک حیات بنا کر خوشی کی زندگی بسر کررہا تھا۔شادی کے کچھ دنوں بعد اس کی بیوی ایک خوف ناک خواب دیکھتی ہے کہ کاسنی رنگ کے گلاب کو وہ اگر بالوں میں نہیں لگا سکے گی تو اس کا گھر اجڑ جائے گا۔بیوی کے اصرار پر اوہام پرست خواب کو پورا کرنے کے لیے ملاح کاسنی رنگ کا گلاب لے آتا ہے۔لیکن اسے اپنی بیوی کے بال میں نہ سجا ہوا بلکہ دوست ''حمری'' کی عبا کے کاج پر دیکھتا ہے۔بیوی کے اس رنگین جھوٹ تراشے پر وہ ناراض ہوتا ہے اور دوست ''حمری'' سے سوال کرتا ہے۔

> ''حمری یہ کاسنی گلاب تمہیں کہاں سے ملا؟'' حمری طبعاً شوخ تھا۔ہنس کر بولا ''کیوں؟ تمہیں کیوں کر فکر پیدا ہوئی؟ میری محبوبہ نے مجھے تحفہ دیا ہے۔نایاب چیز ہے۔؟''

(ڈاکٹر مجیب، حجاب امتیاز علی کے افسانے (افسانہ صنوبر کے سائے میں) کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، سنہ 2008 صفحہ 38,39)

یہ سن کر ملاح کا خون رگوں میں گردش کرنے لگتا ہے۔وہ گھر پہنچ کر بیوی کی ایک بھی نہیں سنتی اور ملاح کا شیطان اس کے سر پر اس قدر سوار ہوتا ہے کہ اپنے شک آلود غصے کے ساتھ بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔جب اس کا دوست یہ بتاتا ہے کہ یہ گلاب اس نے سڑک پر پڑا پایا تھا جو شاید دریچے سے گرا ہوگا۔یہ سن کر ملاح اپنی غلطی پر بے حد نادم ہوتا ہے اور اس کے آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے۔کیونکہ جلد بازی اس کے گھر کو تب تک تباہ وبرباد کرچکی تھی اور یہی افسوس اور غلط فہمی اسے ستر سال سے صنوبر کے سایوں تلے زندگی گزارنے پر مجبور کرتی ہے جو اس کے عشق کی پناہ گاہ ہے۔جس کے سایوں تلے اس کی محبت دفن ہے۔حجاب کے اس طرح کے پلاٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے وقار عظیم نے لکھا ہے:

> ''حجاب امتیاز علی کے رومانی افسانوں میں پلاٹ سے زیادہ افسانہ کی فضا اور اس کے پس منظر میں رومان ہوتا ہے اور اس فضا اور پس منظر میں دنیا سے علیحدگی کے احساس کے باوجود فطرت کی خاموش رومانی کیفیت ہے۔وہ پلاٹ کی اہمیت کو کم کردیتی ہے۔''

(وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987، صفحہ 22)

حجاب کے افسانے عشقیہ موضوع کے ساتھ طنز ومزاح کے بھی عمدہ نمونے ہیں۔وہ مزاح کا لب ولہجہ اختیار کرکے سماجی حقیقت نگاری پر بہترین طنز کرتی نظر آتی ہیں۔افسانہ ''ہم جنس باہم جنس'' طنز ومزاح کا شاہکار ہے۔افسانہ کے مطمح نظر مصنفہ کا مقصد بے جوڑ شادی کے نتائج ہیں۔جس کے ذمے دار گھر خاندان کے ممبر ہوتے ہیں۔افسانے کا آغاز ایک طویل خط کے مطالعے سے ہوتا ہے۔جس میں دوست روحی کو ''کوہ شور'' پر مدعو کیا گیا ہے۔جہاں صوفی اور اس کا شوہر ایام عروسی منا رہے تھے۔جسے پڑھ کر روحی بے حد حیران ہوتی ہے۔اس لیے کہ صوفی کے لیے خوش ہوکر خط لکھنا اس کے لیے کسی معمے سے کم نہ تھا۔کیونکہ افسانے کے مرکزی کردار صوفی کی شادی گزشتہ سال بوڑھے ڈاکٹر بخش سے ہوئی تھی جو عمر کے تقاضے کے ساتھ طرح طرح کے مرض میں مبتلا رہتا جس کے باعث طبعاً خشک مزاج ہوچکا تھا۔جبکہ صوفی نہایت خوش مزاج اور چلبلی لڑکی تھی۔سیر وتفریح کی رنگین فضاؤں کا ہر لمحہ خواب دیکھتی تھی جو بے جوڑ شادی کے بعد تشنہ خواب بن چکا تھا۔ایسے حالات میں صوفی کا بہار کے پھول کی طرح کھل کر خط لکھنا، دوست روحی کو مدعو کرنا اور حیرت کے یہ جملے ''ایام عروسی بسر کررہے ہیں'' جو واقعی کسی معمے سے کم نہ تھا۔حجاب بوڑھے ڈاکٹر سے متعارف کرانے کے لیے جو طنزیہ جملہ اختیار کرتی ہیں وہ ملاحظہ ہو:

> ''میں نے ہنس کر اس فقرے کو دہرایا۔ایام عروسی کا لفظ اس بوڑھے بلے کے نام کے ساتھ ایسا ہی مضحکہ انگیز تھا جیسے کوئل کے ساتھ مینڈک کا۔میں خود اس کی شادی میں شریک تھی۔ نکاح کی صبح دولہا نے بندر ٹوپی پہن رکھی تھی۔یہ میں جانتی ہوں کہ اس روز سردی غیر معمولی تھی مگر خیال تو کیجیے کہ

شادی کے دن ایسا لباس! لباس سے خیالات کا اندازہ بھی کر لیجئے۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا.........بوڑھے ڈاکٹر بخش کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنا ایسا ہی ہے جیسے سولی پر گردن کٹیں، باہمت لڑکی! میں ہوتی تو اک خوراک آیئو ڈین کی پی کر اپنا خاتمہ نہ کر لیتی؟ مجھ میں اتنی ہمت کہاں!''

(ڈاکٹر مجیب، حجاب امتیاز علی تاج کے افسانے (افسانہ ہم جنس باہم جنس)، کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، سنہ 2008، صفحہ 97)

حجاب نے اس افسانے میں بوڑھے ڈاکٹر کے جذبات وتوقعات اور حسین صوفی کے جذبات کے باہمی فرق کو موضوع بنا کر سماج پر طنز کیا ہے۔ حجاب کے اس نوع کے افسانے موضوع کے اعتبار سے سماجی زندگی کا محاسبہ کرتے ہیں۔ عشق، حیرت واستعجاب کے ساتھ مقصد کے گرد گھومتا ہے۔ ڈاکٹر مجیب احمد خاں حجاب کے افسانوی موضوع سے متعلق لکھتے ہیں:

''مجموعی طور پر حجاب کے افسانوں میں فلسفہ حیات کی کارفرمائی موجود ہے۔ ان کے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور پوشیدہ ہے۔ وہ کسی افسانے میں قدیم رسم ورواج اور توہم پرستی کی مخالفت کرتی ہیں تو کسی میں ناانصافی اور ازدواجی زندگی کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں۔ وہ مشرقی قوانین کی خواہاں اور مرد اور عورت میں مساوات کی قائل ہیں۔ وہ ہر مذہب کا ادب واحترام کرتی ہیں۔ لیکن مذہب اسلام کی عقیدت مند ہیں۔ وہ صوم وصلوٰۃ کی حمایت کرتی ہیں۔ اور اپنے موضوعات میں انسانیت کو افضل قرار دیتی ہیں۔ حجاب کے موضوعات میں بڑی دوراندیشی پوشیدہ ہے۔ ان کے سارے افسانے سماج میں رستے ہوئے ناسور کو کسی نہ کسی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک زریں لہر اصلاح کی ضرور نظر آئے گی۔''

(ڈاکٹر مجیب احمد علی خان، حجاب امتیاز علی تاج فن اور شخصیت، صفحہ 101)

حجاب نے اپنے افسانوں کے لیے جو موضوع منتخب کیا وہ محبت، رومان اور ہیبت ناک واقعات ہیں۔ ان کے ہیبت ناک افسانوں میں، کونٹ الیاس کی موت، محبت یا ہلاکت، نیا لفافہ، اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا، لاش، مردے کی چیخ، ممی خانہ وغیرہ ہیں۔ جس میں حجاب رومان کے دلفریب واقعات کی عکاسی اس طرح کرتی ہیں کہ تحیر وتجسس کے ساتھ ماحول خوفناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

''تھوڑی دیر میں قرآن پڑھتا رہا۔ پھر یکا یک میری نظر سامنے کو اٹھی اور میری روح کانپ گئی۔ میں نے دیکھا جنازے پر جو سفید چادر پڑی تھی وہ آہستہ آہستہ ہل رہی تھی ...... کچھ دیر بعد یہ حالت ہوگئی کہ چادر کا کونہ کونہ زور سے ہلنے لگا جیسے کوئی جھنجھوڑ رہا ہو۔ اب تو میرے ہوش وحواش غائب ہوگئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا اٹھنا ہی تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ لاش پر پڑی ہوئی چادر سرک گئی اور پھر ___ ایک کفن پوش سر آہستہ آہستہ جنازے میں سے اٹھتا ہوا نظر آیا......''

(حجاب امتیاز علی تاج، مجموعہ ممی خانہ اور دوسرے ہیبت ناک افسانے، پبلیشر زیونائیٹڈ چاک لاہور 1945 صفحہ 66)

حجاب افسانے کے پلاٹ میں دلچسپی اور تجسس کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کچھ اس طرح کے خوفناک ماحول پیش کرتی ہیں:

''اس نے بند دریچے کی طرف اشارہ کیا، جس میں سے قبرستان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا اور جسے میں اکثر بند رکھا کرتی تھی۔ اس نے دریچہ کھول دیا اور اس میں چڑھ گئی اور پھر باہر کود پڑی۔ میری ششدر نظروں نے چاندنی کے افسوں میں دیکھا کہ وہ اپنی سفید چادر سمیت قبروں پر ہوا میں کسی عظیم خفاش کی طرح تیر رہی ہے۔'' (ایضاً، صفحہ 58,59)

مصنفہ نے پلاٹ کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز سے لے کر انجام تک وحدت تاثر پایا جاتا ہے۔ وہ پلاٹ کے لیے واقعات ڈھونڈ کر لاتی ہیں ان کے افسانوں کے پلاٹ دولت مند گھرانے سے متعلق ہوتے ہیں۔ جن میں نادید عاشق، مہمان داری، میری ناتمام محبت وغیرہ کے پلاٹ بے حد کامیاب ہیں۔ حجاب کے پلاٹ عمدہ ہوتے ہیں، ماحول قائم کرنے میں ان کو مہارت حاصل ہے۔ ان کے ماحول میں خواب کی سی کیفیت پائی جاتی ہے، جو الفاظ کے ذریعے تراشا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے مناظر صنوبر کی ٹھنڈی چھاؤں، آسمان سے اترتی نیلی دھار، ایشیا کا گرم سورج کبھی تندی وتیزی کا مظہر ہوتا ہے اور کبھی نرمی ولطافت کا پیکر، کبھی ان کی دوپہریں کاسنی رنگ کی ہوتی ہیں۔ ان کے درختوں کی گھنی چھاؤں نشیلی اور خواب آور ہوتی ہے اور ان کے درختوں پر چہچہانے والے طیور کے نغموں میں سلا دینے کی تاثیر ہے۔ فضا میں ایک طرح کی سرسراہٹ اور کپکپاہٹ ہے کیونکہ حجاب پلاٹ اور کردار سے زیادہ توجہ ایک سحر انگیز فضا پیدا کرنے میں صرف کرتی ہیں۔ کہیں سیر وسیاحت کے ذریعے قدرت کے مناظر کو دلفریب انداز میں بیان کرتی ہیں تو کہیں خوف

بھری رات کے سناٹے سے حیرت واستعجاب کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔

حجاب کے کردار اگرچہ عام زندگی سے لیے گئے ہیں لیکن وہ کردار مہذب، باشعور اور تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی ضیف الاعتقاد اور اعصابی امراض کے شکار ہوتے ہیں اور جذباتی اتار چڑھاؤ کے علاوہ بشری خوبیوں سے بھرپور نظر آتے ہیں۔ وہ کردار، سر جعفر، ڈاکٹر گار، دادی زبیدہ، روزناش، سرہاری، جسوتی، خود مصنفہ (روحی) کیوں نہ ہوں لیکن سب کے سب ایک مخصوص ماحول ایک خاص فرقے اور صاحب ثروت افراد ہیں۔ ان تخیلی کرداروں کا رشتہ حسن وعشق سے ہے لیکن ان میں قربت ورفاقت نہیں بلکہ صرف دوستی کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ کردار نگاری کے سلسلے میں سید سجاد حیدر یلدرم کا کہنا ہے کہ:

> ''ان کے افسانوں کے کیریکٹر (اشخاص افسانہ) ایک مستقل خاندان کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ دادی زبیدہ، ڈاکٹر گار، سرہارلی، جشن زورناش وغیرہ سے اب ہم سب اس قدر وابستہ ہیں جیسے اپنے عزیز دوستوں یا رشتہ داروں سے اور ان کی سوانح حیات سے ہم کو اس قدر گہرا تعلق ہے جیسا کہ وہ فیروز، کوہ الماس، کیپاس، دریائے ناشپاس کے ساحل یا جزیرہ عباس کے رہنے والوں کو ہوسکتا ہے۔''

(حجاب امتیاز علی تاج ، از مقدمہ سجاد حیدر یلدرم، ناول ظالم محبت، دارالاشاعت پنجاب لاہور، 1940 صفحہ 3)

حجاب کے نمائندہ رومانی افسانوں میں اندھی محبت، میری ناتمام محبت، مرد اور عورت، سبز آنکھ، صنوبر کے سائے، نجومی کی وصیت، طلوع وغروب، مرد کی چیخ، لاش، شیطان، مردے نے کیا کیا، نادیدہ عاشق، کونٹ الیاس کی موت، نیالفافہ، محبت یا ہلاکت، اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا، مہمان داری وغیرہ شامل ہیں۔

حجاب نے رومانی کہانیوں کے ساتھ متعدد ناول بھی تخلیق کیے۔ ان ناولوں میں ظالم محبت، پاگل خانہ، اندھیرا خواب، وہ بہاریں یہ خزائیں وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں بھی تخیل کی بلند پرواز اور رومانی وخیالی وخوابناک حسین دنیا موجود ہے۔ اپنے افسانوں کی طرح خوف، تحیر واستعجاب کے ذریعے ناول کے لیے بھی رومانی فضا تیار کرتی ہیں۔ گویا ان کی تحریر کردہ ناول ایک دلچسپ داستان معلوم ہوتے ہیں، کہانی کو اس خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں کہ قاری کا ذہن اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر 'پھر کیا ہوا' کا جذبہ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور اسی دلچسپی کے ساتھ ناول اختتام تک پہنچ جاتا ہے۔ اچھے ناول کا دارومدار اس کے پلاٹ اور کرداروں پر ہوتا ہے۔ ناول کے پلاٹ میں واقعات کو اس طرح پیوست کر دیا جائے کہ کہیں پر کوئی واقعہ یا بحث غیر موزوں نہ لگے، حجاب کے ناول ان خوبیوں سے معمور ہیں۔ ان کے پلاٹ اکہرے اور سادہ ہیں اور کہانی کے تسلسل میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتے اور حیرت واستعجاب کے ساتھ دلچسپی کا عنصر ناول کے اختتام تک قائم رہتا ہے، اور قاری قصے کی اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔

ناول ظالم محبت کا پلاٹ اکہرا اور سادہ ہے۔ کہیں پر کوئی ناہمواری نظر نہیں آتی۔ بحثیں طویل مگر معنیٰ خیز، پراثر، دردانگیز اور بڑی حد تک رومانی ہیں۔ اگر ان بحثوں کو خارج کر دیا جائے تو پلاٹ میں جھول پیدا ہو جائے گا۔ انھوں نے اس ناول میں ایک اعلیٰ خاندان کے دو افراد کی محبت کا بیان بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ ناول میں وہ سبھی خوبیاں موجود ہیں جو عشقیہ ناول کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

حجاب کا ایک اہم اور کامیاب ناول ''اندھیرا خواب'' ہے جو 1950 میں براہ راست کتابی شکل میں شائع ہوا۔ موضوعاتی اعتبار سے یہ ایک نفسیاتی ناول ہے۔ ناول کی انفرادیت یہ ہے کہ حجاب نے نفسیات جیسے خشک ومشکل موضوعات میں دلکشی اور رومان کی فضا خلق کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ تحلیل نفسی کی تکنیک میں مصنفہ نے عشقیہ جذبات کو بڑی خوبصورتی سے ناول کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ناول ''اندھیرا خواب'' کا تانا بانا مرکزی کردار صوفی کے دورہ کا شکار ہونے کی وجہ (سرخ رنگ) کے گرد گھومتا ہے۔ ناول کے آغاز میں صوفی کو زبیدہ دادی کے گھر تمام ناز ونعمتوں کے ساتھ پلتے دکھایا گیا ہے پھر صوفی کی بیماری (دورہ) کے ذریعے واقعات آگے بڑھتے ہیں اور آخر میں یہ راز فاش ہوتا ہے کہ صوفی کو سرخ رنگ سے دہشت کیوں ہے؟ اس دہشت کی وجہ حجاب صوفی کے ساتھ گزرے ہوئے المیہ واقعات سے بیان کرتی ہیں۔ اس طرح ''ماضی بعید'' کے ذریعہ یہ واضح ہوتا ہے کہ صوفی کے لاشعور کے نہاں خانوں میں ایک ایسا واقعہ موجود ہے جو اس کے دورہ کی اصل وجہ ہے۔ پیدائش سے قبل صوفی کا والد شراب کے نشے میں اس کی ماں کو جسمانی اذیتیں دیتا تھا اور والد کی یہ حرکت صوفی کے ہوش سنبھالنے تک جاری تھی۔ سرخ رنگ سے دہشت اصل میں اس کے والد کا شرابی آنکھیں تھیں جو انگارے کی مانند تھیں۔ اگرچہ وہ ماں کے انتقال کے بعد دادی زبیدہ کے گھر خوش وخرم زندگی بسر کر رہی تھی لیکن اس کے شعور اور لاشعور میں والد کی سرخ رنگ ابھی بھی موجود تھا جو اس کے اندر ہر لمحہ دہشت کی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ حجاب نے ناول میں فلیش بیک کی تکنیک

استعمال کر کے کہانی کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ پلاٹ میں کہیں جھول پیدا نہیں ہوتا ہے اور رومانی لب ولہجہ ناول کی دلچسپی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''گرم موسم کے سبز آسمانوں پر کاسنی چاند بڑی تیزی سے اوپر کو بڑھتا چلا آرہا تھا۔ وہ چاند کے مقابلے میں ایک کمزور کرن کی طرح عشق پیچاں کی بیلوں میں بیٹھی تھی۔ چہرہ زرد تھا اور آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔''

(حجاب امتیاز علی تاج، ناول اندھیرا خواب، دارالاشاعت پنجاب 1950 صفحہ 137)

حجاب نے دیگر ناولوں کے برخلاف ''اندھیرا خواب'' میں نفسیات کا موضوع منتخب کر کے اس پیچیدہ پہلو کو روشن کیا ہے جو انسانی حافظے میں لاشعوری طور پر موجود ہوتی ہیں اور وقت اور حالات کے ساتھ اٹھتی اور ابھرتی ہیں۔ جس سے انسان شعوری طور پر اذیتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے واقعات کوئی آسیبی اور طلسماتی نہیں بلکہ ایک طرح کی ذہنی بیماری ہے۔ چنانچہ حجاب نے مذکورہ ناول میں رومانی طرز کے ذریعے نفسیاتی کشمکش کو روشن کیا ہے۔ انھوں نے انسان کے نہاں خانوں میں جھانک کر حقیقی زندگی کو بے نقاب کیا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار صوفی کا دورہ ناہموار ماحول، بے رحم سلوک، والدین کی خود غرضی اور عالم طفولیت میں گزرے صدمات کے باعث جنم لیتے ہیں اور ہنستی کھلتی زندگی اس کے شکنجے کا شکار ہو جاتی ہے۔

حجاب اپنے ناولوں میں سماجی مسائل کو رومانی پیرائے میں بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کا ایک اور اہم ناول ''پاگل خانہ'' ہے جس کا موضوع امن و آشتی ہے۔ مصنفہ زمینی ماحول میں دن بہ دن شدید تبدیلی کو دیکھ کر خوف زدہ ہوتی ہیں کیونکہ یہ تبدیلی انسانی روح کے لیے ایک خطرہ بن کر کھڑی ہے۔ جدید ٹکنالوجی، ایٹمی تجربات دھماکے، فیکٹریوں سے اٹھنے والے دھوئیں فالتو کیمیائی اشیاء کو سمندروں میں بہانا ان سب چیزوں نے اوزون کی تہہ کو کمزور کر دیا ہے اور ہم قدرتی تحفظ سے محروم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ حجاب ڈاکٹر گار کی زبانی اس طرح کے مسئلے و ضرورت کو کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

''ڈاکٹر گار بولا: ہاں! ہماری مجبوری یہ ہے کہ آج کے ترقی یافتہ ماحول میں ہر قدم پر اس کے محتاج ہیں۔ بغیر فیکٹریوں کے ہماری ضروریات کیسے پوری ہو سکتی ہیں۔ مصنوعی کھاد اور کیڑے مار دواؤں کے بغیر زراعت کے کام کیسے چل سکتے ہیں؟ ایٹمی تجرباتی دھماکوں کے بغیر دنیا کی جنگوں کی تیاریاں کیسے مکمل ہو سکتی ہیں۔؟ مگر ان سب کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ انسان کے تحفظ کے لیے زمین کے گرد لپٹی ہوئی آکسیجن گیس کی تہہ کمزور پڑتی جارہی ہے اور ہم براہ راست تابکاری کی لپیٹ میں آرہے ہیں۔ پیچیدہ جلدی امراض اور کینسر کی وبا ہوتی جارہی ہے۔ موسم بھی بے قابو ہو چلے ہیں۔ موسموں کی بے اعتدالیوں کے جو اثرات انسانی ذہن اور صحت پر پڑ سکتے ہیں۔ انہیں عام آدمی قابل اعتنا نہیں سمجھتا مگر وہ اہل نظر کے لیے اظہر من الشمس ہیں۔'' (ایضاً........صفحہ 45)

حجاب اس دنیا کو ایک پاگل خانہ اس لیے قرار دیتی ہیں کہ اس میں زندگی بسر کرنے والے اشخاص ہی خالص قدرتی حسین فضا اور غذا کی جگہ جدید مقصد وزراعت کے سبب دنیا کو قبرستان میں تبدیل کر رہے ہیں۔ اس عمل اور ردعمل کی بنیادی وجہ بتاتے ہوئے وہ فرائڈ کی اس کتاب Mar against himself کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ جس میں فرائڈ نے نفسیات پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''آدمی اپنا دشمن'' خود ہوتا ہے۔ مصنفہ ناول کے دیباچہ میں اس موضوع پر بحث وتنقید کرتے ہوئے زمانہ جاہلیت اور سائنسی دور کو یکساں قرار دیتی ہیں اور ساتھ ہی کئی سوالیہ نشان بھی قائم کرتی ہیں۔ مثلاً:

''سچ تو یہ ہے کہ عہد ماضی کے غاروں میں رہنے والے وحشی اور آج کے سائنسی علوم کے ماہر آدمی میں کوئی فرق نہیں۔ آج بھی دونوں کا انجام یکساں ہے۔ بڑھاپا ـــــ بیماری ـــــ قبر کا تاریک ایک گڑھا!

انسان کے ان تین عبرتناک بنیادی مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سائنس کے خالق مزید تخریب کاری کی طرف کیوں دوڑ رہے ہیں۔؟ ـــــ

کیا ان کا اولین فرض یہ نہیں ہے کہ بنی نوع انسان کے ان بنیادی اذیت ناک مسائل کا حل تلاش کریں جن کی ایک کڑی وہ خود بھی ہیں؟''۔

(حجاب امتیاز علی تاج، ناول پاگل خانہ، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1988 صفحہ 61)

حجاب کے ناول کردار اور پلاٹ دونوں لحاظ سے کامیاب ہیں۔ کسی طرح کا کوئی نقص یا جھول نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے حجاب شاید تنہا فن کار ہیں جن کے ناولوں اور افسانوں کے سبھی کردار ایک نام سے ہیں، اس وجہ سے ایک دفعہ ان کے کردار کی سیرت واوصاف سے متعارف

ہونے کے بعد دوبارہ نئے سرے سے سمجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ حجاب کی کہانیوں میں سب سے اہم کردار ''روحی'' کا ہے جو عقلمند، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فلسفیانہ خیالات کی مالک ہے اور سیر و سیاحت کا جذبہ رکھتی ہے، وہ امیدوں پر قائم رہتی ہے۔ وہ کائنات کے بکھرے ہوئے دلفریب مناظر کا گہرائی سے جائزہ لیتی ہے، ہوابازی کا ہنر بھی رکھتی ہے۔ ساتھ ہی دیگر کردار بھی شوخ اور چنچل اور مزاحیہ قسم کے ہیں اور بے حد رومانی خوبیوں کے مالک ہیں۔

منظر نگاری اگرچہ فکشن کا ایک بنیادی عنصر ہے لیکن حجاب کے یہاں منظر نگاری میں بعض اوقات عجیب و غریب عناصر نظر آتے ہیں۔ مثلاً فضا موسم گرما کی ایک دوپہر کی تیز دھوپ یا خوف بھری رات کے سناٹے سے، سیاہی، سفیدی، افق کی سرخی، احساس خاموشی اور تنہائی سے پیدا کرلی جاتی ہے۔ وہ مہینوں کے نام کو ذہن میں رکھتے ہوئے فطری مناظر اور واقعہ کی ایسی تصویر پیش کرتی ہیں کہ ماحول اور فضا میں حسن اور شدت پیدا ہوجاتی ہے۔ مثلاً:

> ''مارچ کا مہینہ ختم ہو چکا تھا اور ایشیائی اپریل کا آتشیں مہینہ شروع ہو رہا تھا۔ کوئل تمام تمام دن کوکو کیے جارہی تھی۔ شہتوت کی ٹہنیاں نیلے نیلے شہتوتوں سے لدنے لگی تھیں۔ تالاب میں کنول کھلے ہوئے تھے۔ رات کے وقت دریچوں سے ہارسنگار اور چنبیلی کی لپٹیں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ سنہری دھوپ اب لو کی طرح تپنے لگی تھی۔ ہری ہری گھاس دھوپ کی تپش سے جل کر سنہری ہو رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں عریاں تھیں اور باغ میں گرم ہواؤں کے سبب دن بھر ویرانی طاری رہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس سال ریاست کیپاس میں سخت گرمی پڑے گی۔''

(حجاب امتیاز علی تاج، ناول ظالم محبت، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، 1940 صفحہ 73
(

حجاب کی فکشن نگاری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں دلکش اسلوب شگفتہ لب ولہجہ اور دل آویز انداز بیان پر ملکہ حاصل تھا۔ ان کے منفرد انداز نگارش میں تراشی ہوئی تشبیہوں، استعاروں اور تراکیب کا استعمال قابل لحاظ ہیں۔ ان کے اسلوب کو جو چیز دلکش بناتی ہے وہ فضا اور تحیر ہے اور یہی ان کی تحریر کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔ حجاب کا طرز نگارش شاعرانہ ہے اور انھوں نے موضوع کے اعتبار سے اپنے اسلوب کا انتخاب کیا ہے۔ حجاب کی زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ ہمیں دوسرے مصنفین کی طرح ان کے یہاں بھی ان کے مخصوص لفظیات کی بہتات دکھائی دیتی ہے۔ جیسے غصیلی موجیں، نیلگوں آسمان، کاہیدہ بدن، دریچی، ایشیائی جون، مہیب موج، سکوت مطلق، شعبدہ بازیاں، پژمردگی، حلیم الطبع، فریفتہ، شوراک، گردنی فیتہ، اے میرے معبود وغیرہ وغیرہ۔ چھوٹے چھوٹے لفظوں میں ترنم اور اشاریت کے ساتھ تشبیہات واستعارات کا خوبصورت استعمال ان کی جمالیاتی حس کی نشاندہی کرتا ہے۔

حجاب کے افسانوں کی طرح ان کے ناول کا بھی ایک انفرادی مقصد ہوتا ہے۔ خواہ وہ رومانی موضوع پر لکھا گیا ناول ''ظالم محبت'' ہو یا ''پاگل خانہ''۔ جس کا تانہ بانہ سائنس، فلسفہ، مذہب، سیاست جیسے خشک موضوع پر محیط ہے۔ ظالم محبت میں انھوں نے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے جس کا شکار زمانہ جاہلیت سے معصوم لڑکیاں ہوتی چلی آرہی ہیں۔ جسوتی کی آرزؤں اور خواہشوں کا خون محض ایک ناول کے کردار کا خون نہیں بلکہ سیکڑوں معصوم لڑکیوں کا خون ہے جو آج بھی رسم و راج اور سماجی بندھنوں کے سبب سلیب پر چڑھا دی جاتی ہیں۔ ان کی آرزؤں اور جذبوں کا سرعام خون کردیا جاتا ہے۔ چھ سالہ جسوتی کو شادی کے بندھن میں جکڑ دینا انسانیت پر بہت بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ حجاب رومانی لب ولہجے میں سماجی جبر کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر حجاب امتیاز علی کے فکشن سے متعلق لکھتی ہیں:

> ''اردو فکشن میں حجاب امتیاز علی کو وہی اہمیت حاصل تھی جو ان کے فوراً بعد کے دور میں عصمت چغتائی کو ملی اور یہ دونوں خواتین صاحب طرز اور منفرد افسانہ نگار تھیں۔ گو دونوں کے یہاں زندگی کے رویے ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد تھے۔ ایک کے یہاں موتیا کی ٹہنی پر گانے والی کوئل، کاونٹ لوٹ اور مادام زبیدہ تھیں اور دوسری کے یہاں درانتی اور ہتھوڑا۔''

(ڈاکٹر مجیب احمد خان، حجاب امتیاز علی تاج فن اور شخصیت، صفحہ 9,10)

چنانچہ حجاب کے یہاں ایک شدید قسم کی رومانی فضا ملتی ہے۔ لیکن وہ اس تخیلی فضا کو پیش کرتے ہوئے معاشرے کے مسائل سے بیگانہ نہیں ہوتیں۔ اردو میں رومانی طرز کی خواتین فکشن نگاروں کی فہرست میں ان کا مقام ''خاتون اول'' کا ہے۔

□□□

Shagufta Parween
Research Scholar
Delhi University
Delhi-110007

شاعرات کے منتخب اشعار

عمر بھر دیکھا ہوا وہ آرزو کا خواب تھا
کتنی آسودہ ہوئی ہوں اپنے ہی انکار سے

ہر ایک دور میں سچ کہہ کے سنگسار ہوئے
ہمارے حق میں زمانے کا فیصلہ کب تھا

نور جہاں ثروت

شعر جس چیز کا ہے نام اسا
وہ بھی اک دل کی آہ ہوتی ہے

تیرہ بختوں کے روز روشن کی
روشنی بھی سیاہ ہوتی ہے

اسما سعیدی

دل سے اکثر سوال کرتی ہوں
کیوں میں لمحوں میں جیتی مرتی ہوں

اپنے سائے سے پاؤں چھٹکارا
روز ایسی دعائیں کرتی ہوں

شائستہ یوسف

نہ پا سکی میں کبھی جس کی گرد پا تک بھی
وہی خیال میں بن کے غزال آتا ہے

قدم قدم پہ بہاروں کا حسن ہے لیکن
مجھے تو یاد تمھارا جمال آتا ہے

ام ہانی

اس طرح کھینچی ہے میرے گرد دیوار خبر
سارے روزنوں کو بے نظر اس نے کیا

لازم تھا اب کہ ذوق تماشا کو دیکھتی
کب تک تمھاری آنکھ سے دنیا کو دیکھتی

پروین شاکر

لڑکیاں ماؤں جیسے مقدر کیوں رکھتی ہیں
تن صحرا اور آنکھ سمندر کیوں رکھتی ہوں

عورتیں اپنے دکھ کی وراثت کس کو دیں گی
صندوقوں میں بند یہ زیور کیوں رکھتی ہیں

عشرت آفرین

ذہن کی دیوار پر اترے ہیں ماضی کے پرند
خواہشوں کے پھر کسی نے چھت پہ دانے رکھ دیے

میں سوکھی ڈال ہوں لیکن تمھاری یادوں کے
پرند آ کے سرِ شام بیٹھ جاتے ہیں

ملکہ نسیم

ہماری آنکھ کے حلقے ریاضتوں کے گواہ
ہمیں خرابیِ قسمت کے ذمہ دار ہوئے

وہ چھانٹتے رہے شاخ اور سایہ دار ہوئی
یہی تو بات بہت ان کو ناگوار ہوئی

نسیم سید

ڈاکٹر راشد میاں

ام الاحرار و مجاہد آزادی

بی اماں

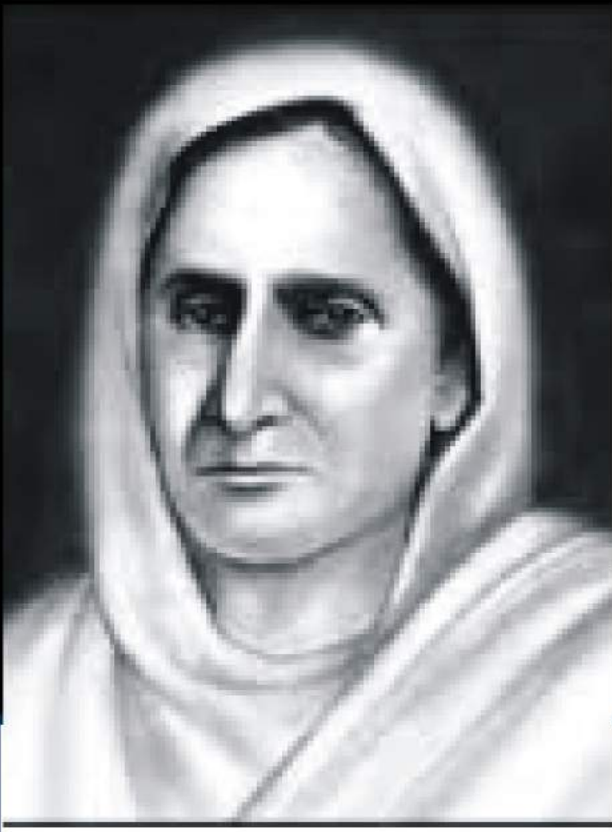

جنگِ آزادیٔ ہند میں جن خواتین نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں ان میں صفِ اول کے ناموں میں عبادی بانو بیگم (والدہ مولانا محمد علی جوہر) المشہور ''بی اماں'' کا نام نمایاں طور پر ان کی خدمات و جفاکشی کی بدولت قابلِ ذکر ہے۔ یقیناً وہ ایک سرگرم اور بے مثال مجاہدِ آزادی تھیں۔ آزادیٔ ہند سے متعلق مشہور ''تحریکِ خلافت'' اور اس کے روحِ رواں علی برادران (شوکت علی و محمد علی) کی والدہ اپنے نام کے بجائے ''بی اماں'' کے لقب سے مشہورِ زمانہ ہوئیں۔

عبادی بانو بیگم کی ولادت امروہہ کے محلّہ دستار سیاہ میں 1850 میں ہوئی۔ آپ کے خاندان کا تعلق امروہہ کے معزز گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد مظفر علی خاں اور دادا غلام مولا خاں جذبۂ حب الوطنی کے سبب انگریزوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ عبادی بانو بیگم کو بھی جذبہ حب الوطنی اور انگریزوں سے عداوت ورثے میں ملی تھی۔ جب وہ محض سات برس کی تھیں، تب مئی 1857 میں امروہہ میں انگریزوں کے خلاف ایک جارحانہ مظاہرہ اور بغاوت ہوئی تھی۔ بچپن میں انگریزوں کے خلاف ایسی شدید بغاوت کے اثرات عبادی بانو بیگم کے ذہن پر مرتسم ہوئے۔ ان ہی اثرات کی بدولت وہ 'بی اماں' اور عظیم مجاہدِ آزادی کہلائیں۔

1868 میں عبادی بانو رام پور دربار سے وابستہ ایک معزز شخصیت عبدالعلی خاں کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئیں۔ جن سے بی اماں کے چار نرینہ اولادیں اور ایک لڑکی کی ولادت ہوئی۔ چوتھے لڑکے کی پیدائش کے بعد بی اماں کے خاوند اچانک چل بسے۔ جس سے ان پر پریشانیوں اور ذمہ داریوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن اس کے باوجود بی اماں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا مصمم عزم کر لیا تھا۔ سسرال کی مخالفت کے باعث وہ اپنے دو بیٹوں شوکت علی اور محمد علی کے ساتھ امروہہ آ گئیں۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے اپنے زیورات فروخت کر کے

دونوں لڑکوں کو علی گڑھ سے گریجویشن تک تعلیم دلائی۔ پھر آکسفورڈ یونیورسٹی لندن، سے وابستہ لنکن کالج سے موڈرن ہسٹری میں پوسٹ گریجویشن کرایا۔ اس کے بعد 1898 میں محمد علی جب لندن سے لوٹے تو سات سال تک وہ سول سروس بڑودہ میں رہے۔ لیکن بی اماں کا مطمحِ نظر لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر معزز عہدوں پر فائز کرانا نہیں بلکہ انھیں مادرِ وطن ہندوستان کی جنگِ آزادی کا مجاہد بنانا تھا۔ بی اماں کا یہ خواب نہ صرف حقیقت بنا بلکہ یہ دونوں لڑکے ''علی برادران'' کے لقب سے مشہور ہو کر آزادیٔ ہند کی تحریک خلافت کے اہم رکن و تاریخ ساز کردار کہلائے۔

تحریکِ خلافت کا بنیادی پس منظر یہ ہے کہ کرۂ ارض بالخصوص ملک ہندوستان کا حقیقی مالک و حاکم خدائے بزرگ و برتر ہے۔ بادشاہ خدا کا صرف نائب، خلیفہ یا نگراں ہوتا ہے۔ ہندوستان کی عوام خلیفہ بھی مقامی ہی چاہتی ہے، وہ راہزن انگریزوں کی حکومت کو کسی قیمت پر پسند نہیں کرتی۔ چونکہ یہ تحریک آزادیٔ ہند سے متعلقہ تھی لہٰذا بابائے قوم و ہند مہاتما گاندھی نے بی اماں اور ان کے دونوں فرزند شوکت علی و محمد علی کو اپنی تحریک کے ساتھ منسلک کر لیا۔ اس طرح علی برداران و بی اماں تحریک آزادی کے ملکی سطح پر اہم کردار بن گئے۔ دونوں لڑکے (علی بردران) اپنی والدہ کو 'بی اماں' کہہ کر پکارتے تھے۔ مہاتما گاندھی و دیگر محرکینِ آزادی نے بھی انھیں 'بی اماں' کے لقب سے بارہا مخاطب کیا، چنانچہ عبادی بانو بہت جلد پورے ملک و بیرونِ ہند میں 'بی اماں' کے لقب سے شہرت پا گئیں۔ حتّٰی کہ آج تک دنیا میں وہ اسی لقب سے مشہور ہیں۔

حالانکہ بی اماں بظاہر ناخواندہ تھیں، مگر ان کا ذہن و شعور بہت حساس تھا۔ ہندوستان کے کثیر تعداد والے مسلم علاقوں کی خواتین میں ان کی جوشیلی تقاریر کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ بی اماں کے ساتھ بلبلِ ہند سروجنی نائڈو، سرلا دیوی، بیگم حسرت موہانی، بسنتی دیوی وغیرہ مذکورہ تحریک آزادی میں پیش پیش تھیں۔ مہاتما گاندھی کے ایما پر بی اماں کو عورتوں کی تحریک کا قائد تسلیم کیا گیا۔ 1914 میں جب ان کے لڑکے علی برادران کو انگریزوں نے گرفتار کیا تو بی اماں ایک شعلہ بیان بن کر ابھریں۔ 1919 میں بی اماں اور علی برادران نے انگریزی حکومت کو یاد دہانی کراتے ہوئے مسلمانوں کی مذہبی بارگاہوں کی حفاظت سے متعلق آواز اٹھائی، جس کی پاداش میں علی برادران کو دوبارہ گرفتار کر کے کراچی جیل میں مقید کر دیا گیا۔ اس وقت بی اماں انگریزی حکومت کے اس جبر و ظلم کے خلاف اپنی مزید شعلہ بیانی سے ام الاحرار بن گئیں۔ بی اماں کے صدق جذبات کو شاعر اقبال سہارنپوری نے اپنی نظم ''صدائے خواتین'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

بولیں اماں محمد علی کی
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

گر ذرا سست دیکھوں گی تم کو
دودھ ہرگز نہ بخشوں گی تم کو
میں دلاور نہ سمجھوں گی تم کو
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ہو تم ہی میرے گھر کا اجالا
تھا اس واسطے تم کو پالا
کام کوئی نہیں اس سے اعلا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ پڑھ خلافت پہ مرنا
پورے تم امتحاں میں اترنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

کھانسی آئے اگر تم کو جانی
مانگنا مت حکومت سے پانی
رکھے اللہ جوش و جوانی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

غیب سے میرے امداد ہوگی
اب حکومت یہ برباد ہوگی
حشر تک اب نہ آباد ہوگی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

مذکورہ نظم علی برادران اور خواتین کے ساتھ ہندوستانی مجاہدینِ آزادی کے لئے پیامِ حریت اور پرچم نو ثابت ہوئی۔

بی اماں کے 30 دسمبر 1917 کے ایک اجلاس میں پیش کئے گئے پیامِ حریت سے ملک و ملت سے ان کی محبت، ان کا جذبہ آزادی، جفاکشی، شعلہ بیانی اور اصولِ حیات کے بہت سے نقوش ابھرتے ہیں۔ مذکورہ پیامِ حریت کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:

''جس وقت میرے بچوں کی آزادی کے متعلق شملہ پر مشورے ہو رہے تھے اور خفیہ محکمہ کا افسران کے پاس کچھ شرائط لے کر آیا تھا اور وہ وقت شوکت علی اور محمد علی کے لیے ایک سخت امتحان کا وقت تھا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ انسپکٹر

خفیہ ان سے ایک تحریری وعدہ مانگ رہا ہے تو تم نے سنا ہوگا کہ میں کس طرح وہاں گئی اور میں نے اس سے اور شوکت علی ومحمد علی سے کیا کہا۔

میں نے خفیہ محکمہ کے انسپکٹر سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرا پیام حکومت کے اعلیٰ حکام تک پہنچا دے اور ان کو اچھی طرح بتا دے کہ اگر چہ اس ضعیف اور سن رسیدہ عورت کا جسم خاکی اب فرسودہ اور کمزور ہو گیا ہے لیکن دل اور دل کے اندر ایمان اتنا کمزور نہیں کہ شوکت علی اور محمد علی کو وہ جادۂ حق سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت دے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر آزادی حاصل کرنے کی کوئی ایسی شرط قبول کریں گے جو اسلام کی شان اور آزادئ ملک کے منافی ہوگی تو باوجود اپنی اس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے اس سے قبل کہ وہ صراطِ مستقیم سے پلٹ سکیں میں انشاء اللہ اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلہ گھونٹ دوں گی۔"

..........آخر میں پھر اپنے عزیزوں سے التجا کرتی ہوں کہ وہ دنیا میں سوائے خدا کے کسی طاقت سے مرعوب نہ ہوں اور اپنے ایمان پر بھروسہ کر کے یقین رکھیں کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو فتح ان کی ہے۔ واللہ مع الصابرین۔ میرا پیام صرف وہی ہے جو ہر مسلمان کو تیرہ سو برس پہلے مل چکا ہے اور جو ہر مسلمان کے قلب پر نقش ہونا چاہیے یعنی یا ایھا الذین امنو الستعینو با الصبر و الصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین۔

(بحوالہ مدینہ بجنور۔5 جنوری 1918)

سروجنی دیوی (نائیڈو) نے اس ضمن میں کہا کہ ہندوستان کی نسوانی آواز کو اجازت دینا کہ وہ اٹھیں اور جو مطالبات مردوں کی طرف سے ہو رہے ہیں، ان کی تصدیق کریں۔ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ ہم کامل اور ذمہ دارانہ سیلف گورنمنٹ کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ....خدا کرے کہ ہندوستانی مرد اس طرح کام کریں کہ وہ ہندوستانی خواتین کی امداد حاصل کر سکیں۔

(اخبار جمہور کلکتہ، 10 جنوری 1918۔ بحوالہ نیو انڈیا)

بی اماں کو سب سے شدید صدمہ اس وقت ہوا جب انگریزی حکومت نے برطانوی پرچم لالِ قلعہ پر لہرایا، بی اماں نے اس کے خلاف 1923 میں سخت احتجاج کیا۔ حتیٰ کہ عمر کے آخری زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد میں جب اسکالرز نے گاؤن پہنی تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے بھرے مجمع میں خود کا برقع اتار دیا کہ ہندوستان کی فصیل (لال قلعہ) کو انگریزوں نے بے پردہ کر دیا، اب میں برقع اس وقت پہنوں گی جب لال قلعہ پر ہندوستان کا پرچم لہرایا جائے گا۔ یہ موقعہ ہندوستانی خواتین کے لیے پر جوش اور یادگار رہا تھا۔

اگر چہ آزادئ ملک کے بعد بعض حضرات نے بی اماں کی ملکی وقومی خدمات پر خامہ فرسائی کی ہے مگر ایک اہم تحقیقی مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ تاریخ میں برائے پی ایچ ڈی ڈاکٹر پی وی پاسر نے پروفیسر ایس دیو دواکر کی نگرانی میں بعنوان The Brave Mother of Rampur Biamma تحریر کیا ہے۔ مرکزی حکومت کے تعلیمی و تحقیقی ادارے NCERT نے بھی بی اماں کو اردو نصاب میں شامل کیا ہے۔ مگر بی اماں کی شخصیت و خدمات پر مزید تحقیقی کاوش کی گنجائش ابھی باقی ہے۔ قائدانہ صفات کی حامل ہندوستان کی اس عظیم خاتون مجاہدِ آزادی نے تہتر (73) برس کی عمر پا کر 1924 میں وفات پائی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

بابائے قوم مہاتما گاندھی نے اپنی مشہور تصنیف: Eight Lives A study of the Hindu Muslim Encounter میں بی اماں کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

ایک جوان مسلم بیوہ نے کس طرح کسمپرسی میں سادہ زندگی بسر کرتے ہوئے اور پیغمبرِ اسلام کی زندگی کو مثال بنا کر اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی اور ان میں حب الوطنی کی جوت جلائی۔ اس کی عملی اور قابلِ تقلید مثال "بی اماں" تھیں۔ جن کو میں سلام پیش کرتا ہوں۔

درحقیقت بی اماں اپنے اعمالِ صالحہ اور بے لوث ملکی وقومی خدمات کے سبب ہندوستانی عوام کے قلوب میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گی۔

ماٰخذ:

1۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں خواتین کا حصہ، مرتبہ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین

2۔ ایوانِ اردو، دہلی، @75 جشنِ آزادی نمبر

□□□

Dr. Rashid Miyan

Mohalla Ghol

Near Masjid Ghol,

C/o Qamar Ghalib,

Tonk-304001 (Raj.)

Mob: 7240302056

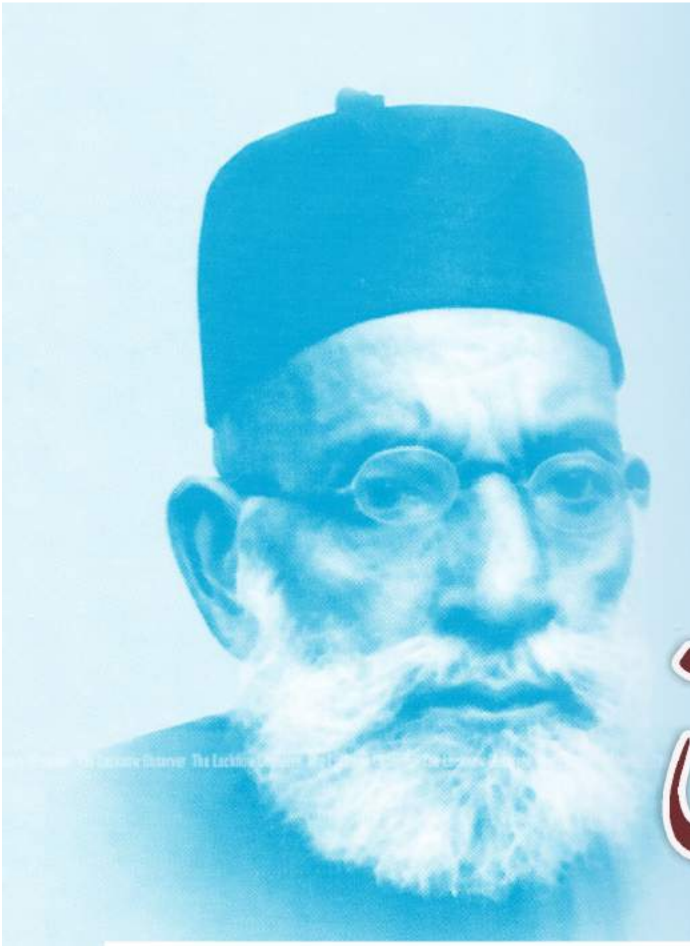

مجاہد آزادی حسرت موہانی

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا شمار بیسویں صدی کے نصف اول کی ان شخصیتوں میں کیا جاتا ہے، جنھوں نے ہر میدان میں اپنی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے حصول آزادی اور غلامی سے نجات کے لیے نہ صرف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ بے انتہا مصیبتوں کا بھی سامنا کیا۔ جیل گئے وہاں چکی کی مشقت اٹھائی لیکن اپنے مقصد سے ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ حسرت بے باک صحافی، شاعر، مجاہد، تذکرہ نگار اور تنقید نگار ہونے کے ساتھ ساتھ سوشلزم اور کمیونزم کے بھی حامی تھے۔ وہ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں سمجھتے تھے۔

حسرت موہانی کا دور تاریخ میں انقلابی دور کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر شعبے میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ لوگ مشرقی روایات و اقدار کو چھوڑ کر مغربی طرزِ عمل کو ترجیح دینے اور اس کی روش اختیار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک طرف روایتی اقدار کا زوال تو دوسری طرف نئی نئی قدریں وجود میں آنے کے لیے بے چین تھیں۔ تعلقہ دارانہ ماحول اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگا تھا۔ رہی سہی کسر اشتراکی نقطۂ نظر نے پوری کر دی تھی۔ حسرت قصبہ موہان میں پیدا ہوئے ان کے تاریخ ولادت میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ حسرت کے سوانحی حالات پر مشتمل سب سے پہلی کتاب ''حالات حسرت'' میں ان کا سن ولادت 1298ھ بمطابق 81-1880 اور نیاز فتح پوری نے ان کا سن ولادت 1887 جب کہ دوسرے سوانح نگاروں جن میں ''جدید شاعری'' کے مولف 'عبد القادر سروری ''مختصر تاریخ ادب اردو'' کے مصنف ڈاکٹر سید اعجاز حسین ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی وغیرہ نے حسرت کی تاریخ ولادت 1875 مانا ہے۔

(حسرت موہانی حیات اور کارنامے/احمر لاری ص68)

ان کا پورا نام سید فضل الحسن اور حسرت تخلص تھا۔ لوگ انھیں حسرت کے نام سے یاد کرتے تھے اور انھیں بھی اپنے نام سے زیادہ اپنا تخلص پسند تھا۔ جس کے بارے میں وہ خود ایک شعر میں وضاحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

حسرت کی تعلیم و تربیت ایک دیندار و مذہبی گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کی تربیت میں ان کی والدہ اور نانی کا بہت عمل دخل رہا۔ ان کی ابتدائی تعلیم قصبہ موہان میں غلام علی کے مکتب میں ہوئی۔ علاوہ ازیں موہان کے ہی سرکاری اسکول سے مڈل کلاس کا امتحان امتیازی نمبروں کے پاس کیا اور فتح پور ہسوہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا جہاں انھوں نے مولانا سید ظہور السلام اور مولانا نیاز فتح پوری کے والد مولانا محمد امیر خاں سے استفادۂ سخن کیا۔ فتح پور سے انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ چلے

آئے۔فتح پور میں ہی ان کی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی ،لیکن شخصیت کی تشکیل میں علی گڑھ اوراس کے ماحول کا بہت اہم رول رہا ہے۔ جہاں وہ کالج کے ہر جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے ساتھ ساتھ کالج کے دوسرے فرائض کو بھی بخوبی سرانجام دیتے ۔رسالہ ''اردوئے معلّٰی'' کے ناظم کی حیثیت سے کام کرنے کے ساتھ ہی وہ طلبا کے یونین سکریٹری اور فوڈ مانیٹر بھی رہے۔ان کے حلقۂ ارباب میں سجاد حیدر یلدرم ،مولانا شوکت علی، بہادر سید ابو محمد، محمد حیات گوالیاری جیسے ذوق سخن شامل تھے اور جن کی بدولت اکثر شعر و سخن کی محفلیں بھی آراستہ و پیراستہ ہوتی رہتی تھیں۔علی گڑھ میں ہی ان کے سیاسی سفر کا بھی آغاز ہوا۔1903 میں انھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی ۔1904 میں انھوں نے ممبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔1905 میں وہ سودیشی تحریک آل انڈیا کانفرنس کی سرگرمیوں سے وابستہ ہو گئے ۔اوراس تحریک کی حمایت اورعوام میں اسے مقبول بنانے کی غرض سے انھوں نے اردوئے معلّٰی میں مضامین بھی لکھے اور ایک سودیشی اسٹور بھی کھولا۔جس کا مقصد بدیشی مال کا بائکاٹ اور سودیشی مال کا فروغ تھا۔1907 میں انڈین نیشنل کانگریس کے نظریاتی اختلافات کی بنا پر وہ اس تحریک سے الگ ہو گئے ۔1908 میں انھیں مصر میں انگریزوں کی حکمت عملی کو تنقید بنانے اوراس پر ایک مضمون اردوئے معلّٰی میں شائع ہونے کی سزا دو سال کی قید کی صورت میں ملی۔ان کی تصنیف ''قید فرنگ'' اسی قید و بند کی یادگار ہے اور جس کا بہت سا حصہ ''مشاہداتِ زنداں'' کے نام سے اردوئے معلّٰی میں بھی شائع ہوتا رہا۔1916 میں انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو آزاد تعلیمی ادارہ بنانے اور دوسرے مسلم تعلیمی اداروں سے اس کے الحاق کی تجویز پیش کیے جانے پر حکومت نے انھیں للت پور جیل میں بند کر دیا۔حالانکہ کچھ عرصے بعد ان کو رہا بھی کر دیا گیا۔1921 میں انھوں نے احمد آباد میں کانگریس کے اجلاس میں ''مکمل آزادی'' کا ریزولیشن پیش کیا جس کی گاندھی جی نے سخت مخالفت کی اور ایک غیر ذمہ دارانہ فعل قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔1925 میں کانپور میں ہونے والی پہلی آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کا انعقاد حسرت کی کوششوں سے ہی عمل میں آیا اور وہ ترقی پسند انجمن (کانپور) کے صدر منتخب ہوئے ۔ترقی پسند ادیبوں کی حمایت اور ان کے خیالات کی ترویج کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادب کی حمایت اوراس کے اعلان نامے سے اتفاق اوراس کے حق میں صدائے حق بھی بلند کی۔ کمیونسٹ پارٹی کے متعلق غلط تصورات کا دفاع کرتے ہوئے انھوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

''کمیونزم ایک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے اس تحریک کے اصول اوراغراض و مقاصد سے جمہور اہل ہند عموماً اتفاق کرتے ہیں ۔البتہ بعض صریح غلط فہمیوں کی بنا پر کمیونزم کے نام سے بعض کمزور اور وہمی لوگ گھبراتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خوں ریزی لازم و ملزوم ہیں۔حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم لوگ عدم تشدد کو ضرورت و مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں۔ اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بطور اصول لازم قرار نہیں دیتے۔'' (روشنائی۔سجاد ظہیر ص132، 133)

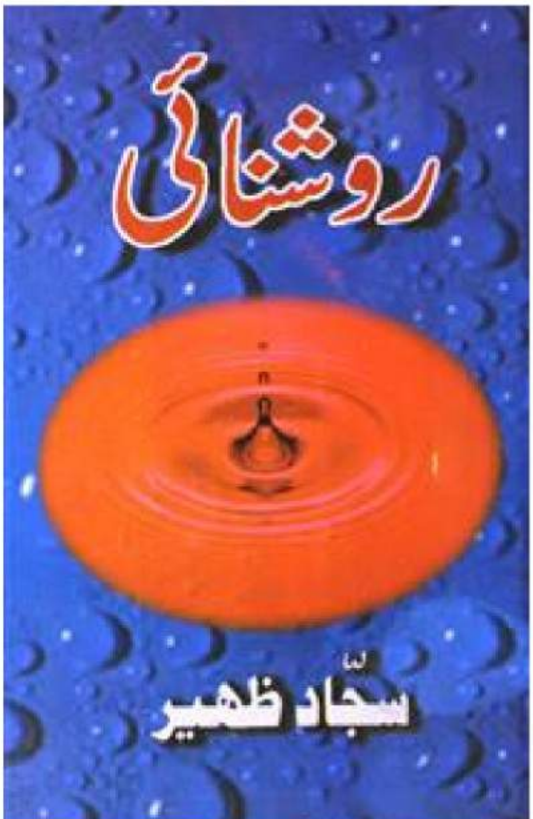

کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن ہونے کے باوجود وہ اپنے عقائد کو بھی مضبوطی سے تھامے رہے۔انھوں نے اپنے خطبے میں اسلام اور کمیونزم کی توسیع کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی پرزور مذمت کی۔اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کمیونسٹ پارٹی کے اغراض و مقاصد کو اجاگر کیا۔زکوٰۃ ،اور صدقے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشش کہ اسلام میں حقوق العباد سب سے زیادہ اہم فریضہ ہے۔مظلوموں کی حمایت اور سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت اور آزادی کی تحریک میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔عوام الناس کی تکلیف اور پریشانی کو اپنی پریشانی اور ان کے سکھ کو اپنا سکھ سمجھتے

تھے۔مذہب کی آڑ میں پروپگنڈا کرنے والے ہمیشہ حسرت کا نشانہ بنتے اور وہ ان کے غلط تصورات وخیالات کی تردید کرتے اور انجمن کی حمایت میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنے سے بھی نہیں گھبراتے تھے۔سجاد ظہیر حسرت کی ترقی پسندی کے حوالے سے ''روشنائی'' میں لکھتے ہیں:

''جب کبھی انجمن پر وہ حضرات حملہ کرتے تھے جن کے مکروہ رجعت پسند چہرے مذہب کی نقاب سے ڈھکے ہوئے تھے تو مولانا حسرت ہماری تحریک کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے تھے، اور انہیں منہ توڑ جواب دیتے تھے۔لیکن مولانا سیاست کی طرح ادب میں بھی متحدہ محاذ کے تصور سے سخت متنفر تھے۔ہمارے خیال میں ترقی پسند ادبی تحریک میں محض سوشلسٹ یا کمیونسٹ ہی نہیں بلکہ مختلف عقائد کے لیے جگہ تھی۔انجمن اِن سے وطنی آزادی اور جمہوریت میں یقین رکھنے کا مطالبہ کرتی تھی۔مولانا اس معاملے میں انتہا پسند تھے۔ان کے نزدیک ترقی پسند کے لیے اشتراکی ہونا ضروری تھا۔ہمارے لیے یہ ضروری نہیں تھا۔'' (ایضاً)

حسرت نے کلاسیکی اردو غزل کو ایسے دور میں پروان چڑھایا جب لوگ جدید اردو نظم کی طرف مائل ہو رہے تھے۔انھوں نے نظم جدید کی مخالفت کرنے کی بجائے خود جدید نظمیں لکھ کر ثابت کر دیا کہ کوئی بھی ادب ناکارہ نہیں ہوتا، ہر ادب کا اپنا ایک وجود ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ خود کو حالات کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔انھوں نے کلاسیکی اردو غزل کا تعین ایسے وقت میں کرایا جب لوگ کلاسیکی سرمایہ سے انحراف اور اس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔حسرت کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید رجحان کو کم کرنے کی بجائے، کلاسیکی اردو غزل کو پھر سے صحت وتوانائی عطا فرمائی، ساتھ ہی اپنے رومانوی اندازِ بیان سے صنف غزل کو پھر سے زندہ وجاوید کر دیا۔اردو ادب میں حسرت کی پہچان کی عشقیہ غزلوں کی وجہ سے ہے۔حالانکہ انھوں نے حمد، نعت، منقبت وغیرہ بھی لکھیں لیکن انھیں شہرت ان کی غزلوں کی بدولت ہی نصیب ہوئی۔ان کی شاعری میں عشقِ حقیقی اور عشق مجازی کے ملے جلے تاثرات ایک پرکیف فضا قائم کرتے ہیں۔حسرت نے اپنی شاعری کو دردوغم سے دور رکھنے کی کوشش کی۔یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری محبوب ایک شوخ چنچل اور لاپرواہ رومانوی محبوب ہے جو محبوب کی جدائی میں واویلا نہیں کرتا اور نہ ہی جدائی، شکایت، رونا دھونا، نارسائی، جیسے عناصر شعری ماحول کو غمگین کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری کو غمِ جاناں سے دور رکھا جس کے سبب ان کی شاعری ہنستی، مسکراتی زندگی کا نغمہ گاتی ہوئی اور دنیا کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ان کا لب ولہجہ نشاط وشباب، حسن کی رنگینی اور عشقیہ رنگ میں پوری طرح ڈوبا ہوا نظر آتا ہے، جس کو اپنی غزل کے ہر شعر میں برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور وہ اس میں کامیاب بھی ہیں۔وہ عموماً حسن وشباب کے ہی شاعر ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ان کے ذوق، تصورات وخیالات کا رنگ غالب آ گیا ہے، اور یہ رنگ آج تک پھیکا نہیں پڑا۔انھوں نے اپنی شاعری کو غمِ جاناں، غمِ عشق، نالہ و فریاد، زمانے کی ستم ظریفی، اور دردوغم، اضطراب، جیسے عنوانات سے دور رکھنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اضطراب، بے کلی، اور شکایتی عنصر ان کی شاعری میں مل جاتے ہیں۔لیکن یہ ایک امید بخش حقیقت ہے کہ ان کے کلام میں جان کھپا دینے والا دردِ دل اور نڈھال کر دینے والا رنج وغم نظر نہیں آتا۔جس کا ذکر وہ اپنے شعر میں بھی کرتے ہیں ؎

گزاری شغل عاشقی میں مرحبا حسرت
نہ پاس آنے دیا غم ہائے بے پایان دنیا کو

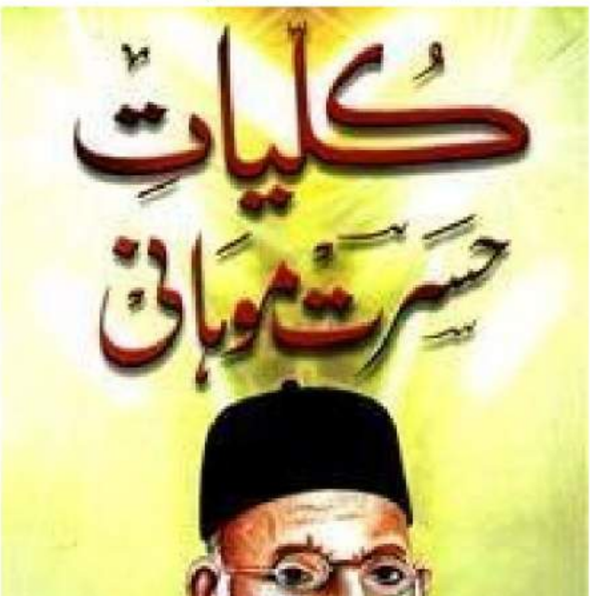

ڈاکٹر سید عبداللہ کلیات حسرت کے دیباچے میں ان کی شاعری کی خصوصیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسرت کی شاعری کبھی باسی نہیں ہوسکتی۔ہمیشہ تازہ رہے

گی جب تک اردو زبان زندہ ہے (اور انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گی) اور جب تک جوانی آتی رہے گی اور نسل انسانی پر شباب مسکراتا رہے گا اور ہمیشہ مسکراتا رہے گا اس وقت تک حسرت کی غزل تازہ رہے گی اور مسکراتی رہے گی۔"

(دیباچہ کلیات حسرت موہانی)

حسرت کا لب و لہجہ کلاسیکی دلکش شائستہ اور شیریں ہیں۔ان کی غزلوں کی عمدگی، خوبصورت تراکیب، سادگی، شوق شیریں بیان، لطافت رنگینی، تصورِ عشق، نشاط و امید، موسیقیت یہ تمام اجزا، ان کی غزلوں میں تغزل پیدا کرتے ہیں اور تغزل ہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے جس کی بدولت انھیں رئیس المتغزلین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں اصلیت، واقعیت، مصوری، وارداتِ قلب، عشق کی رعنائی اور پیکر تراشی کے تمام لوازمات موجود ہیں۔انھوں نے اپنے کلام میں لکھنوی اندازِ بیان، محاورات اور تراکیب کو بھی اپنایا ہے۔میر، مصحفی، مومن، نسیم اور غالب کے علاوہ فارسی شعرا سعدی، جامی، فغانی، نظیری، اور شمس تبریز سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔اور انھوں نے ان سے استفادہ بھی کیا، ساتھ ہی اپنی شاعری میں ان شعرا کا ذکر بھی نہایت مؤثر انداز میں کیا ہے۔

حسرت اردو میں ہے غزل تیری
پرتوِ نقشِ سعدی و جامی

اردو میں کہاں ہے اور حسرت
یہ طرز نظیری و فغانی

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

حسرت کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری ہمہ جہت موضوعات کا مرکز ہے۔جس میں رنگینی، چاشنی، لطافت، بے کیفی، سرمستی، دلکشی، سادگی، حسن کاری، اور موضوعات میں تنوع بھی ہے۔ساتھ ہی تصوف اور جنسی جذبہ یہ دو اہم جز بھی ان کی شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری تصوف کی حسین وادیوں کی سیر کراتی ہے۔وہ اپنی شاعری میں بزرگوں، اور صوفی سنتوں کا ذکر نہایت محبت و عقیدت اور احترام کے جذبے سے سرشار ہو کر کرتے ہیں۔جہاں وہ ایک طرف غوث اعظم کی محبت میں ڈوب کر شاعری کرتے ہیں وہیں کرشن کی سریلی بانسری کا نغمہ ان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ان کے ذوق نے ان کے دل و دماغ میں جو نرمی اور شیرنی پیدا کی تھی وہ ان کے تصوف کا ہی کمال تھا۔بقول آل احمد سرور:

"وہ بیک وقت صوفی بھی تھا اور اشتراکی بھی۔وہ گہری مذہبیت کے باوجود لا مذہبیت کا بھی ایک مذہب کی طرح احترام کرتا تھا۔وہ شاہ عبدالرزاق کا فدائی سری کرشن جی کا دلدادہ ہوتے ہوئے مارکس اور لینن کا بھی ماننے والا تھا۔"

(اردو ادب' حسرت نمبر/ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ص 9۔از آل احمد سرور)

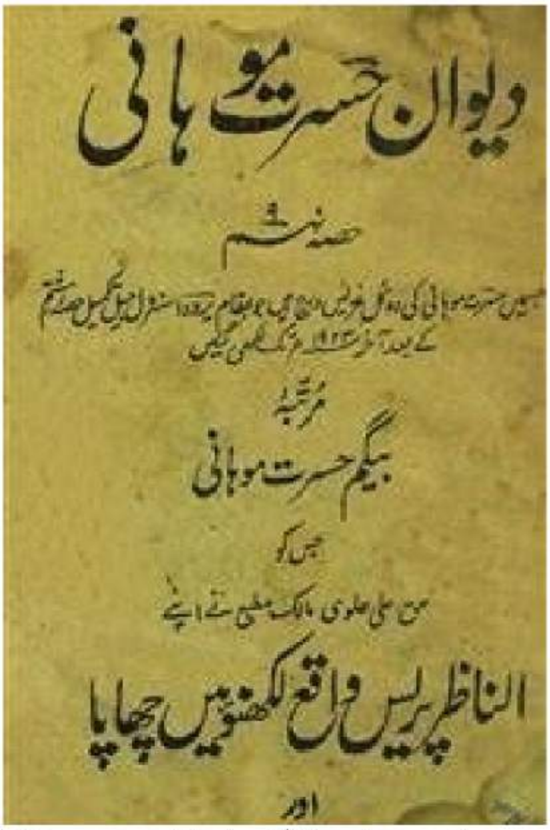

ان کی شاعری محبوب کی گلیوں کے خوشنما نظارے، معشوق کی اداؤں، سر تاپا، جفا، وصل، ہجر، حیا، شوخی، زمانے کی بے اعتنائی، نیز عشق مجازی کے سفر کی پوری داستان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ان کی شاعری اس دور کی عکاس ہے، جس میں سیاسی وسماجی واقعات کا عکس صاف جھلکتا ہے۔ان کی شاعری کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

محبت کے عوض رہنے لگے ہر دم خفا مجھ سے
کہو تو ایسی کیا سرزد ہوئی آخر خطا مجھ سے

ان کے وعدے کی شب کھا کر فریبِ آرزو
سیج کس کس شوخ سے ہم نے سجائی آپ کی

طعن احباب سنے سر زنش خلق سی
ہم نے کیا کیا تیری خاطر گوارہ نہ کیا

حسن بے پروا کو خود بین و خودآرا کر دیا
کیا، کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

تاثیرِ برق حسن جو ،ان کے سخن میں تھی
ایک لرزش خفی مرے سارے بدن میں تھی

حسرت کی شاعری میں عشقیہ خیالات وجذبات کے علاوہ جدو جہد آزادی ،احساس قیدوتنہائی ،تکالیف ،حب الوطنی ،رہائی کی جستجو ،چکی کی مشقت ،جیسے عنوانات قید کی تاریک کوٹھری میں ایک مردِ مجاہد کی بازگزشت بن کر ابھرتے ہیں اوران کی اسیری کے وقت کی دلی کیفیت کواجاگر کرتے ہیں۔دوران اسیری ان کا دلی اضطراب ایک آہ بن کر لفظوں کے قالب میں ڈھل کر شاعری کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ان کی قید و بند کی زندگی اور سیاسی جدوجہد اور عملی زندگی کے درمیان تضاد کی کیفیت ہے لیکن ان کے سیاسی اور مذہبی مسلک کا اثر ان کی شاعری پر زیادہ نہیں پڑا:

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
قید تنہائی میں بھی تنہا نہیں ہے یادگار
آہ وہ شہر کانپور کی شام وہ لب آب وہ کنارۂ گنگ

مولانا حسرت موہانی نے اردو صحافت اور تذکرہ نگاری میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیے اور اپنی صحافت کے ذریعے اردو صحافت کو وہ مقام دلایا جو وقت کی ضرورت کے پیش نظر قوم کی بھلائی اور عوام کی رہنمائی کر سکے۔انھوں نے اردوئے معلیٰ کے ذریعے سیاسی کشاکشی کو دور کرنے کی کوشش کی اور سنجیدہ صحافت نگاری کو فروغ دیا۔انھوں اردو تذکرہ نگاری کے ذریعے اردو شعرا کی شاعری پر روشنی ڈالی اور ان حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی جواب تک پردۂ اخفا میں تھے۔اس طرح انھوں نے بہت سے شعرا کے حالات قلم بند کر کے ان کے ادبی کارناموں کو اجاگر کیا ،اور انھیں دنیائے ادب سے روشناس کرایا۔انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شعرا کے کلام کی تدوین و ترتیب میں صرف کیا۔ایک نقاد کی حیثیت سے ان کی شخصیت ہمہ تن مختلف جہتوں کی حامل نظر آتی ہے۔انھوں نے اردوئے معلیٰ اور نکاتِ سخن میں اردو شاعری پر ادبی وتنقیدی مضامین لکھ کر شاعری کے معائب و محاسن سے پردہ اٹھایا اور اردو تنقید نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔بلاشبہ حسرت ایک اچھے تنقید نگار بھی تھے جنھوں نے اردو شاعری پر تنقید کے ذریعے اس کے رموز واوقاف سے بھی واقف کرایا۔وہ چاہتے تھے کہ نوجوان نسل مغربی ادبیات کے ساتھ ہی مشرقی علوم اور روایت کی بھی پاسدار رہے۔ان کی تنقید دراصل ان نئے ابھرتے ہوئے شاعروں اور ادیبوں کے لیے بھی مشعلِ راہ تھی جو مشرقی روایات سے بے زار اور مغربی ادب کی پیروی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔چناچہ ان کی شاعری کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسرت انبساطِ غم کا شاعر نہیں بلکہ نشاط انگیز اور امید سحر کا شاعر ہے جس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ احساس وجذبات کی دلکش رنگینی میں ڈوبا ہوا ہے۔

ماخذ

1۔دیوان حسرت موہانی
2۔حسرت موہانی ایک تعارف ،منظر عباس نقوی
3۔اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ،خلیل الرحمٰن اعظمی
4۔ماہنامہ ،حسرت بمبئی جنوری 1925

□□□

Khushnuma
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

ضیاء الرحمٰن

شہر بانو بیگم کی خود نوشت 'بیتی کہانی'

خودنوشت سوانح میں انسان اپنی پوری زندگی کا محاسبہ کر کے اپنی تحریری داستان دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اردو میں خودنوشت سوانح انگریزی کی دین ہے۔ حالانکہ انگریزی زبان سے پہلے عربی اور فارسی میں بھی اس کی روایت مربوط و منظم شکل میں ملتی ہے۔ جس کی مثالیں قدیم مذہبی صحیفوں اور یونانی و ہندوستانی دیومالائی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان زبانوں نے اُردو کی خودنوشت سوانح نگاری پر نہایت ہی اہم اور گہرے اثرات مرتب کیے۔ اردو زبان وادب میں خودنوشت تحریر کرنے کا سلسلہ (1857) اٹھارہ سوستاون عیسوی میں شروع ہوا جو مختلف شکلوں، اَدوار اور مراحل سے گزرتے ہوئے اردو میں اپنی مستحکم جگہ بنانے میں کامیاب ہوئی۔ اردو میں اپنی شناخت پانے سے قبل جو خودنوشتیں منظرعام پر آئیں ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تاریخی ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھیں ادبی مقام نہیں مل سکا۔ تاہم یہ خودنوشتیں اردو خودنوشت کے ارتقائی سفر طے کرنے میں پوری طرح سے مددگار ثابت ہوئیں۔ اس لیے اُنھیں اردو کی اولین خودنوشت کی حیثیت حاصل ہے۔ ایک طویل عرصہ تک محققین کے ذریعہ دریافت دو خودنوشتوں کے بارے میں اولین ہونے کی معلومات حاصل ہوتی ہیں جن میں نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کی خودنوشت سوانح ''البقاء المنن بالقاء المحن'' اور جعفر تھانیسری کی خودنوشت ''کالا پانی'' شامل ہیں۔ اس عہد کی تحریر کردہ ان دونوں خودنوشتوں کے علاوہ کوئی دوسری خودنوشت برسوں تک منظرعام نہیں آئی اور نہ ہی محققین کے ہاتھ لگی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے اسی عہد میں قلم بند کی گئی ایک بہترین نسوانی خودنوشت شہر بانو بیگم کی ''بیتی کہانی'' موجود تھی جو 1995 میں ڈاکٹر معین الدین عقیل کی تحقیق کے بعد منظرعام پر آئی۔ اس تحقیق سے قبل اردو کی پہلی خودنوشت کون ہے اس تعلق سے بھی تحقیق نگاروں کے یہاں اختلافات ہیں۔

ڈاکٹر ندیم احمد اپنے ایک مضمون ''بیسویں صدی میں خودنوشت سوانح عمری'' میں مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت ''تواریخ عجیب'' کو اُردو کی اولین خودنوشت قرار دیتے ہیں، تو وہیں علیم الدین سالک بھی اپنے مضمون ''آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو'' میں لکھتے ہیں کہ پہلی جو خود نوشت اُردو میں تحریر کی گئی وہ مولانا جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی'' ہے جو ''تواریخ عجیب'' کے نام سے بھی موسوم ہے۔ کچھ تحقیق نگار نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کی خودنوشت سوانح ''البقاء المنن بالقاء المحن'' کو اردو کی پہلی خودنوشت تسلیم کرتے ہیں۔

محققین میں عبدالمجید قریشی کا نام سرِ فہرست ہے انھوں نے 'الزبیر: آپ بیتی نمبر 1964 بہاولپور' میں شائع اپنے مضمون ''آپ بیتی اُردو ادب میں'' میں اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت، نواب صدیق حسن خاں کی خودنوشت سوانح کے بعد شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ یعنی عبدالمجید قریشی کے مطابق نواب صدیق حسن خاں کی خودنوشت، اردو کی اولین خودنوشت ہے۔

راقم کی نظر میں تحقیق کردہ دونوں خودنوشتوں کے متعلق جو جواز پیش کیے گئے ہیں وہ اپنی اپنی جگہ درست ہیں اور مسلم بھی ہیں مگر تمام محققین اپنی تحقیق میں سال اشاعت کے ساتھ ساتھ مہینے کی بھی وضاحت کردیتے تو اردو کی پہلی خودنوشت کون سی ہے اور کون سی نہیں یہ مسئلہ بھی حل ہوجاتا۔ بہرکیف جعفر تھانیسری نے اپنی خودنوشت ''کالاپانی'' (تواریخ عجیب) کے شروع میں اس کا سنہ اشاعت 1885 تحریر کیا ہے۔ لیکن اِسی خودنوشت کے آخر میں پنجاب حکومت کی جانب سے جاری کردہ ایک سرکاری خط کا ذکر بھی ملتا ہے جس کی رُو سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا کی خودنوشت 6 جنوری 1888 میں منظر عام پر آئی ہوگی یا پھر وہ اسی سنہ کے آس پاس مکمل ہوئی ہوگی۔

(بحوالہ: مشمولہ نقوش نمبر، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور 1964 صفحہ نمبر 523)

کالاپانی جیسی مختصر سی تصنیف میں تھانیسری نے اپنے طویل زمانہ اسیری کے حالات، گرفتاری، مقدمہ، قیدوبند، انڈومان کا سفر، انڈومان کی زندی اور رہائی کے حالات وغیرہ نہایت ہی موئر اور دلچسپ انداز میں تحریر کیے ہیں۔

اسی دوران میں ایک تیسری خودنوشت نواب اکبر علی خان (رئیس پٹودی) کی صاحب زادی شہر بانو بیگم نے ''بیتی کہانی'' کے نام سے تحریر کی تھی اور 1887 میں دیباچہ کی اضافت کے ساتھ اس کو کتابی شکل بھی دے دی گئی تھی لیکن وہ کسی وجہ سے منظر عام نہ پر آسکی اور نہ ہی وہ اُردو خودنوشت کی روایت اور تاریخ میں اپنی جگہ بنا سکی۔ خودنوشت ''بیتی کہانی'' ایک طویل عرصہ تک یوں ہی محققین کی نظروں سے پوشیدہ رہی مگر کسی بہانے وہ معروف نقاد و محقق معین الدین عقیل کو دستیاب ہوئی۔ انھوں نے اس کو ازسرِ نو ترتیب دے کر 1995 میں شائع کیا۔ معین الدین عقیل اس خود نوشت کے تعلق سے اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''ایک اور خودنوشت سوانح عمری اب تک منظر عام پر نہ آنے کے باعث کسی کی توجہ حاصل نہ کرسکی۔ اسے شہر بانو بیگم نے ''بیتی کہانی'' کے عنوان سے 1885 میں تصنیف کیا تھا اور قریب قریب ڈیڑھ سال بعد اس میں محض دیباچہ کا اضافہ کر کے اسے کتابی شکل دی۔ اس لحاظ سے اسے نساخ اور جعفر تھانیسری کی مذکورہ تصنیف سے قبل تخلیق میں آنے والی اور اولین نسوانی خودنوشت سوانح عمری کہا جانا چاہیے۔''

(مقدمہ بیتی کہانی صفحہ نمبر 18)

معین الدین عقیل نے اپنے اس اقتباس میں یہ واضح کیا ہے کہ شہر بانو بیگم نے ''بیتی کہانی'' کو 1885 میں تصنیف کیا اور ڈیڑھ سال بعد اس میں دیباچہ کا اضافہ کر کے کتابی شکل دی لیکن وہ شائع ہوکر منظر عام پر نہیں آسکی۔ لیکن اب وہ خودنوشت جب معین الدین عقیل کے ذریعہ منظر عام پر آہی گئی تو ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ''بیتی کہانی'' خودنوشت نساخ اور مولانا جعفر تھانیسری کی مذکورہ تصنیف سے قبل تخلیق کی گئی ہے کیوں کہ ''تواریخ عجیب'' بھی اسی درمیان تخلیق کی گئی تھی۔

یہاں ہم ''تواریخ عجیب'' کے اخیر میں شامل سرکاری خط کے لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ شہر بانو بیگم کی خودنوشت ''بیتی کہانی'' اُردو کی اولین خودنوشت ہے۔ معین الدین عقیل کو اپنے اقتباس کے ذریعہ صاف صاف یہ واضح بھی کرنا چاہیے تھا کہ جعفر تھانیسری کی خودنوشت سے قبل ''بیتی کہانی'' لکھی گئی ہے۔ انھوں نے بھی دوسرے محققین کی طرح ''بیتی کہانی'' کے ماہ اور دن کا تعین نہیں کیا بلکہ صرف سنہ بتایا ہے۔ اسی خودنوشت ''بیتی کہانی'' اور دیگر اہم تحقیقات پر معین الدین عقیل کو جامعہ کراچی نے 2003 میں ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لیٹرز) کی سند بھی تفویض کی۔

''بیتی کہانی'' شہر بانو بیگم (نوب اکبر علی خاں رئیس پٹودی کی داستانِ حیات پر مشتمل یہ ایک اولین نسوانی خودشت ہی نہیں ہے بلکہ یہ اردو کی اولین خودنوشت بھی تسلیم کی جاسکتی ہے اور یہ خودنوشت اپنے عہد اور پٹودی خاندان کی تاریخ اور ترجمان بھی ہے۔

مصنفہ نے جس عہد میں اپنی خودنوشت کو قلم بند کیا ہے وہ ایسا دور تھا جب خواتین میں تعلیم کا کوئی خاص رجحان نہیں تھا بلکہ اس وقت خواتین کی تعلیم کے لیے کوئی معقول انتظام بھی نہیں تھا۔ نیز خواتین کے تعلیم حاصل کرنے کو معیوب بھی سمجھا جاتا تھا، اسی طرح اس وقت خواتین تصنیف اور تالیف کا ذوق بھی نہ رکھتی تھیں۔ ایسی صورت میں کوئی خاتون کا وہ بھی حکمراں خاندان سے تعلق رکھنے والی، اگر اپنی خودنوشت تحریر کرتی ہے تو وہ قابل توجہ امر مانی جاسکتی ہے۔

شہر بانو بیگم نے اپنی یہ خودنوشت، ایک انگریز دوست مس فلیچر کی فرمائش پر تخلیق کرنی شروع کی تھی۔ ''بیتی کہانی'' میں پہلی جنگ آزادی کے

بعد حکمراں ریاستوں کی بربادی کا شہر بانو بیگم نے اچھی طرح سے نقشہ کھینچا ہے۔ معاً انھوں نے اس کے بعد اپنی زندگی کے تلخ تجربات، عیش وعشرت کے بعد تکلیف بھری زندگی گزاری حالات و واقعات کا تذکرہ بھی بڑی جانفشانی سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنی شادی سے قبل کی زندگی اور شادی شدہ زندگی کے حالات اور تلخ تجربات وغیرہ کا بھی ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اس ضمن میں معین الدین عقیل اپنے مقدمے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''مصنفہ نے اپنی اس خودنوشت میں اپنی پیدائش 1847 سے لے کر اس تصنیف پر نظر ثانی (جنوری 1887) تک تقریباً چالیس سال کا احاطہ کیا ہے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں کے ساتھ تعاون کے نتیجے میں ریاست پٹودی برقرار رہی اور اس وقت کے رئیس مصنفہ کے والد نواب اکبر علی خاں کے انتقال (1862) کے بعد نوابی کا تسلسل ان کے اخلاف میں کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے۔ لیکن مصنفہ کے بعد کے حالات کا کسی ذریعہ سے کوئی علم نہیں ہوتا ہے۔'' (مقدمہ ''بیتی کہانی'')

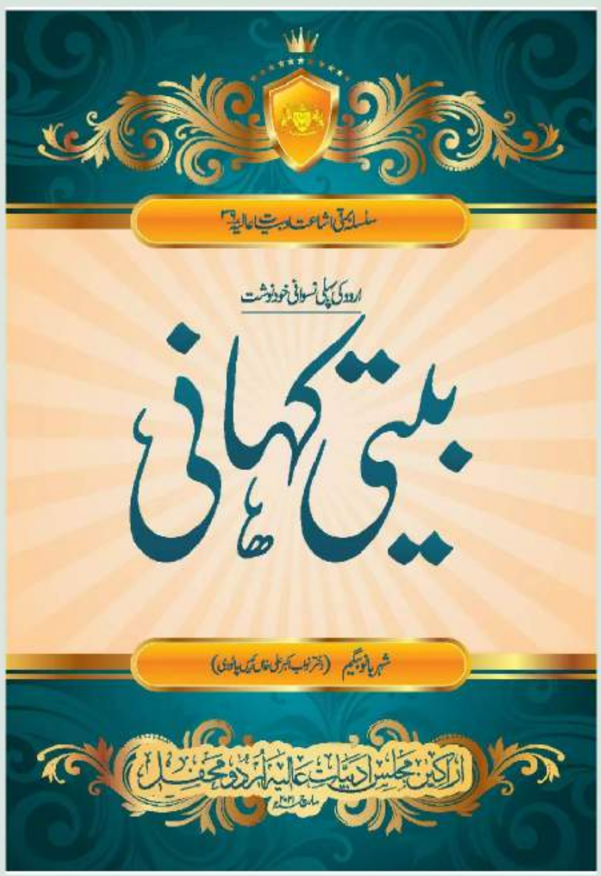

مصنفہ نے خودنوشت میں اپنی زندگی کے تقریباً تمام غیر معمولی واقعات کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے کہیں پر تفصیل سے کام لیا ہے تو کہیں اختصار اپنایا ہے۔ خودنوشت میں تاریخ اور سنین کے اندراج کا بھی مصنفہ نے خاص خیال رکھا ہے۔ ریاست کے تاریخی اور سیاسی پس منظر کے ساتھ ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے تاریخی وسوانحی حالات کو جس اہمیت وافادیت کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کو تاریخ سے گہری دلچسپی تھی اور اس سے گہرا شغف بھی تھا۔ مصنفہ نے خودنوشت میں بعض مقامات پر ایسی جزئیات نگاری کا مظاہرہ کیا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ کی پوری زندگی کی داستان ہماری نظروں کے سامنے تصویری شکل میں موجود ہے۔

اسی طرح سے مصنفہ نے اپنی ذاتی زندگی کے ساتھ ان حوادث کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے جو بالخصوص جنگ آزادی کے دوران پٹودی ریاست اور جھجھر میں رونما ہوئے اور جن کی پاداش میں رؤسا کو جس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد ریاستوں کی بربادی اور زندگی کی تکلیف دہ حالات سے گزر کر مصنفہ نے دلی کو اپنا مسکن بنایا۔ جب یہاں دل نہیں لگا تو اسے بہلانے کے لیے اپنی انگریز دوست کے ساتھ تعلیم وتعلم کا مشغلہ شروع کیا، دونوں ایک دوسرے کو لکھنا پڑھنا سکھاتیں، اسی درمیان شہر بانو بیگم نے اپنی خودنوشت ''بیتی کہانی''، قلم بند کرنی شروع کی۔ اس سے مصنفہ کی تعلیمی لیاقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔مصنفہ کی کوئی خاص تعلیم نہیں تھی بلکہ واجبی تھی اس کے باوجود خودنوشت میں جس طرح کی عام فہم رواں دواں زبان، روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والے محاورے اور مثالیں موجود ہیں اس سے کافی دلکشی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ خودنوشت میں دلی کی زبان کا خاصہ غلبہ بھی ہے۔ بھلے ہی مصنفہ کی تعلیمی لیاقت واجبی تھی اور گھریلو ماحول کی وجہ سے تحریر میں املا کی غلطیاں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود جملوں کا حسن ترتیب، لفظوں کا انتخاب جس فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے اس سے ان کے اظہار وبیان کی صفت ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ املا کی جو غلطیاں خودنوشت میں ملتی ہے وہ کچھ اس طرح سے ہیں، دسترخان، کپڑہ، خطنہ ،نواہ،، وغیرہ ہیں ۔اسی طرح سے بعض جگہوں پر افعال اور اسماء کو بھی توڑ موڑ کر لکھا گیا ہے مثلاً، پڑھ تی' کہاں نی' 'بی وی' وغیرہ۔ اسی طرح سے کئی جگہوں پر جمع کے قاعدوں سے لاعلمی جھلکتی ہے مثلاً 'باتیں چیتیں'، بیگماتوں' وغیرہ۔ بعض جگہوں پر ایسا لگتا ہے کہ مصنفہ نے قدیم الفاظ کو اپنے

انداز میں استعمال کیا ہے۔خودنوشت میں زبان و بیان کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے جگہ جگہ برمحل اپنے شعری ذوق کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا ہے حالانکہ وہ اشعار معروف اساتذہ کے نہیں ہیں اور نہ ہی وہ زبان زد عام تھے۔اس ضمن میں ڈاکٹر معین الدین اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

''زبان کی ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ مصنفہ کا شعری ذوق بھی خاصہ تعجب خیز ہے ۔اپنی معنویت کے لحاظ سے برمحل اشعار کا استعمال جگہ جگہ نظر آتا ہے اور یہ بھی توجہ طلب امر ہے کہ یہ اشعار زبان زد عام اور معروف اساتذہ کے نہیں ۔مصنفہ کی نثر پڑھتے ہوئے یہ یقین رہتا ہے کہ اس کی زبان اور اظہار فطری ہے اکتسابی نہیں ۔اس نے چونکہ یہ ساری سرگزشت مس فلیچر کی فرمائش پر قلم بند کی ،اس لیے دوران سرگزشت بعض مقامات پر مصنفہ نے اس کو ''بوا'' کہہ کر مخاطب کیا ہے اور اپنی سرگزشت جاری رکھی ہے ۔اردو خودنوشت میں تخاطب کی مثال شاید ہی کہیں اور ہوں۔زبان کے استعمال میں روایتوں اور روزمرہ کا لحاظ، جو مصنفہ کی نثر میں واضح ہے،اس وقت ایک عام صفت تھی۔اسی طرح مقفیٰ عبارت کا اہتمام گاہے گاہے مصنفہ کی نثر میں موجود ہے۔ اس قسم کی چند مثالیں ،جس سے اس خودنوشت کی عام لسانی خصوصیات بھی نمایاں ہوتی ہیں۔یوں ہیں:

''کبھی امیری دیتا ہے کبھی فقیری دیتا ہے...... کہیں عزت بخشتا ہے کہیں حقیری''

''میری کہانی پڑھ کر تم کیا نفع پاؤ گی ،رنج و غم کھاؤ گی ،اپنا جی دکھاؤ گی ،اور کچھ حظ نہ اٹھاؤ گی''

''تدبیروں پر تدبیریں پائیں ،دواؤں پر دوائیں بدلیں''

''بھلا میں عورت ،پردہ نشین اور ایک بچہ وہ بھی تین مہینے کی جان۔حواس باختہ عقل حیران ۔آگے عالم تنہائی ،نہ پاس ماں نہ باپ نہ بھائی''

''زندگی کے دن پورے کرتی ہوں جو ایسے ایسے دکھ بھرتی ہوں''۔(مقدمہ بپتی کہانی :صفحہ نمبر 28,29)

خودنوشت میں منظر نگاری کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ جو کچھ جیسا مصنفہ نے دیکھا تھا اس کو اسی انداز میں بلا کم وکاست بیان کر دیا ہے اسی طرح روزمرہ کے حالات ،رسم و رواج کا تذکرہ بھی خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے ۔''بپتی کہانی'' کی مصنفہ شہر بانو بیگم نے اپنی سرگزشت میں تقریباً اپنی زندگی کے تمام گوشوں کو جن حالات وواقعات سے متاثر ہو کر پیش کیا ہے اس کی سچائی اور راست گفتاری کا ثبوت ان کی تمہیدی گفتگو میں نمایاں طور سے ظاہر ہوتا ہے۔وہ تمہید میں لکھتی ہیں:

''اس کے لکھنے میں مجھے کئی باتوں کا لحاظ رہا ہے،اول تو یہ کہ بیان کو بہت طول نہیں دیا،مختصر کیا ہے ۔دوسرے یہ کہ خلاف واقعہ کوئی کوئی بات نہیں لکھی بناوٹ کو ہرگز دخل نہیں دیا۔ عبارت آرائی کچھ نہیں کی اور مطلب کو روزمرہ کی بول چال میں آسان لفظوں میں ادا کیا''۔

مآخذ

1۔بپتی کہانی ،شہر بانو بیگم ،مقدمہ تعلیقات ،داکٹر محمد عقیل ،2006' القمر انٹر پرائز زلاہور

2۔''آپ بپتی اردو ادب میں''عبدالمجید قریشی 'الزبیر' آپ بپتی نمبر'بہاولپور 1964

3۔''آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو''علیم الدین سالک ،مشمولہ نقوش ،آپ بیتی نمبر ،ادارہ فروغ اردو ،لاہور ، 1964

4۔مولانا جعفر تھانیسری ،مشمولہ نقوش،آپ بیتی نمبر،ادارہ فروغ اردو لاہور 1964،

5۔کالا پانی ،جعفر تھانیسری ،1961 سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،

6۔کالا پانی المعروف تواریخ عجیب ،مئولفہ جناب مولانا جعفر تھانیسری ،عبدالعزیز کشمیری بازاز لاہور

7۔کالا پانی ،مولانا جعفر تھانیسری ،مکتبہ اہل حدیث ٹرسٹ کراچی۔

8۔تواریخ عجیب ،مولانا جعفر تھانیسری ،منشی نول کشور 1980

9۔اسلامی تحریک کے ایک مجاہد کی خودنوشت درد انگیز داستان ،مولانا جعفر تھانیسری ،دکن پرنٹرز اینڈ پبلشر (حیدآباد)1848

10۔تذکیر و تحلیل (مضامین) ڈاکٹر ندیم احمد ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی ، 2018

11۔اردو میں خودنوشت سوانح حیات ،ڈاکٹر صبیحہ انور

12۔اردو میں خودنوشت کی روایت ،ڈاکٹر وہاج الدین علوی

13۔نقوش آپ بیتی نمبر 1964 لاہور ،نقوش شخصیات نمبر ،لاہور

□□□

Ziaur Rahman

72, Okhla Village

Jamia Nagar

New Delhi-110025

نازیہ حسن

شیفتہ
شخصیت اور فن

نواب مصطفیٰ خان فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔شیفتہ (1806 تا1869) کی زندگی 54 برس کی عمر پر محیط ہے۔خوش شکل، خوش رنگ، خوش وضع اور ایک عاشق مزاج انسان تھے۔شیفتہ کی زندگی کا ابتدائی زمانہ عیش وعشرت میں گزرا بعد میں عشق کی راہ میں ناکامی کے صدمے سے دل برداشتہ ہوئے تو نانی اور والدہ کو اس کے سوا کوئی اور سبیل نظر نہیں آئی کہ وہ ان کو حج کے لیے آمادہ کریں۔ان کے سامنے حج کی خواہش کا اظہار کر کے انھیں حج کے لیے آمادہ کیا۔سفر حج کے بعد ان کی روش زندگی تبدیل ہوگئی۔ یہ ان کی زندگی کا دوسرا رخ ہے۔اس کے بعد تمام لغویات سے توبہ کرلیا۔اشعار ملاحظہ فرمائیں

جب سے آئے ہیں حرم سے
شوق صنم و خواہش صہبا نہیں رکھتے
شوق خوباں اڑ گیا حوروں کا جلوہ دیکھ کر
رنج دنیا مٹ گیا آرام عقبیٰ دیکھ کر

شیفتہ اردو شعر گوئی اور سخن فہمی کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ شاعر کے علاوہ انھیں شعر وادب کا ایک اہم نکتہ داں کہا جاتا ہے۔انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعری تجربہ کیا۔شعرائے اردو کا ایک تذکرہ بھی لکھا جو ''گلشن بے خار'' کے نام سے مشہور ہے۔اس تذکرہ سے شیفتہ کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے لیکن ان کی اصل شناخت اردو غزل گوئی ہے۔

اردو غزل کی روایت میں شیفتہ کی غزل مجموعی طور پر بہت بڑے اضافے کا باعث نہیں بنی البتہ اس روایت کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا ضرور کیا۔ان کا اصل کارنامہ ایک متوازن اور سادہ اسلوب کی تلاش ہے۔کسی شاعر کی انفرادیت کو سمجھنے کے لیے تین چیزوں کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔خیالات، انداز بیان اور زبان کے معاملے میں شیفتہ کافی مشہور تھے۔ دبستان لکھنؤ کی طرح وہ زبان کی الجھنوں کے پابند نہیں۔ان کی غزل اس اعتبار سے بلند مقام رکھتی ہے کہ انھوں نے زبان و بیان اور شوکت الفاظ کے استعمال میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے۔ انھوں نے سیدھے سادے انداز میں عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے لیکن ان کا کمال یہ

ہے کہ اس زبان کو انھوں نے ادب و شاعری کی زبان بنادیا۔ شیفتہ نے تکلف اور تصنع سے کام نہیں لیا۔ اسی لیے ان کی زبان میں سادگی کا حسن ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری کی انفرادیت ہی ان کا انداز بیان ہے جس کی شہادت خود شیفتہ نے دی ہے:

شیفتہ سادہ بیانی نے ہمیں چمکایا
ورنہ صنعت میں بہت لوگ ہیں بہتر ہم سے
شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نامقبول
اگر اسلوب عبارت میں متانت کم ہو

شیفتہ نے مومن خان مومن کی شاگردی اختیار کی تھی چناں چہ اپنے استاد کے نقش قدم پر چل کر انھوں نے بھی اپنی غزلوں کا اصل موضوع حسن وعشق کو بنایا ہے۔ شیفتہ کے یہاں تصور عشق میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ عمومیت ہے۔ انھوں نے اپنی غزل میں عشق کو ایک عام انسان کا فکری جذبہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں محبوب اور عاشق کے تمام حرکات و سکنات اور واردات و کیفیات میں بعید از قیاس باتیں نظر نہیں آتیں۔

شیفتہ نے اپنے محبوب کو غیر معمولی شخصیت کا حامل نہیں دکھایا ہے بلکہ اس میں عام انسانوں کی سی خصوصیت نمایاں ہیں۔

عاشق بھی ہم ہوئے تو عجب شخص کے ہوئے
جو ایک دم خون کرے سو ندیم کا!
اس وقت ہم گنے گئے احباب خاص میں
آیا جو تذکرہ کبھی لطف عمیم کا
لڑتے ہو جب رقیب سے کرتے ہو مجھ سے صلح
مشتاق یاں نہیں کوئی اس التفات کا
اس شوخ ستم گر سے پڑا ہے مجھے پالا
جو قتل کیے پر بھی تاسف نہیں کرتا
وعدہ کس شخص کا اور وہ بھی نہایت کچا
ہم بھی کیا خوب ہیں سچ مچ ہمیں باور آیا

شیفتہ نے اپنی غزلوں میں محبوب کے ناز وادا کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں بڑے مصورانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایسے محبوب کا تصور پیش کیا گیا ہے جو صرف ظلم وستم اور جور جفا ہی نہیں کرتا بلکہ زندگی سے لطف اندوز ہونا بھی جانتا ہے۔ بذلہ سنجی اس کے مزاج کی اہم خصوصیت ہے۔ ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیں جس کا ہر شعر ڈرامے کا ایک سین بن جاتا ہے:

کہا کل میں نے اے سرمایہ ناز
تلون سے تم کو مدعا کیا
کبھی مجھ پر عتاب بے سبب کیوں
کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا
کبھی تمکین صولت آفریں کیوں
کبھی الطاف جرأت آزما کیا
کبھی شعروں سے میرے نغمہ سازی
کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا
کبھی اس دشمنی پر بہر تسکیں
پئے ہم جلوہ ہائے دلربا کیا
یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلف
جواب ایک مختصر مجھ کو دیا کیا
ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی نہیں ہیں کیا کیا

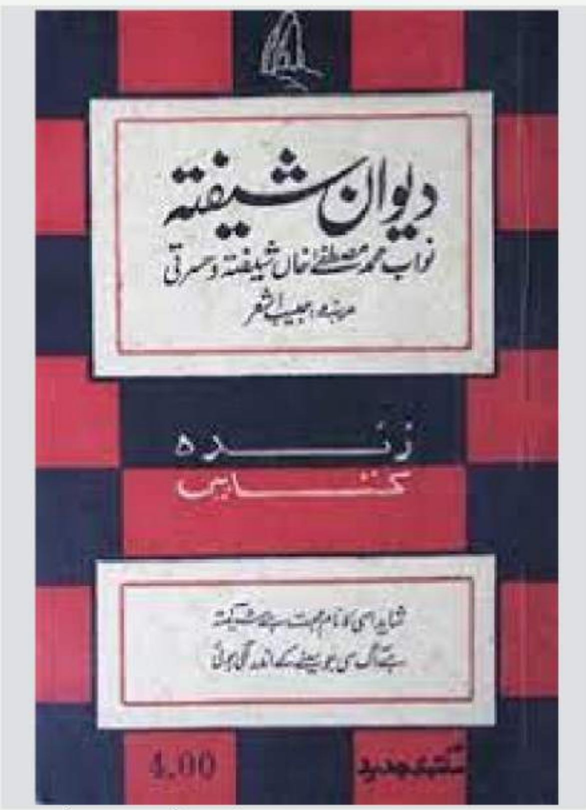

شیفتہ کی غزلوں کا بنیادی موضوع عشق و عاشقی ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ بھی انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورت حال کی عکاسی کی ہے جس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ان کی شاعری کا خمیر اپنے معاشرے میں پھیلے ہوئے انتشار اور

ابتری سے تیار ہوا ہے۔

آرام سے ہے کون جہان خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

اس شعر میں ''جہان خراب'' ایک سیاسی رمز ہے۔اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کا تعلق غدر کے انقلاب اور مصائب سے ہے بالخصوص ان اذیت ناک حالات سے جن سے شیفتہ کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ انگریزوں نے شیفتہ کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا اور جائیداد اور مکانات نذر آتش کردیا تھا۔اس لحاظ سے اس شعر میں آپ بیتی کا رنگ بھی ہے لیکن ان کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی کا روپ دے دیا ہے۔غدر کے ہنگامے کی وجہ سے دلی کی کیا حالت بنی اور دلی والوں پہ کیا بیتی شیفتہ نے اپنی غزلوں میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

مدت ہوئی بہار جہاں دیکھے ہوئے
دیکھا نہیں کسی نے گل بے خزاں ہنوز
حسرت سے اس کے کوچے کو کیونکر نہ دیکھئے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا
نہ مے کدے میں ترانہ نہ خانقاہ میں سماع
دعائے خیر ہے اس آفت جہاں کے لیے

شیفتہ کی غزلوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں بارہا ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی اخلاقی درس موجود ہوتا ہے:

ہر شغل میں اہم ہے نگہبانی نفس سے سوا
اس سے سوا جہاں میں شغلِ اہم نہیں
شیشہ اتار شکوہ کو بالائے طاق رکھ
کیا اعتبار زندگی بے ثبات کا
کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھئے تو بہت کم خیال ہے

اگر رنگ ومزاج کے علاوہ شیفتہ کی شاعری کو دیکھا جائے تو وہ ایک قادرالکلام شاعر نظر آئیں گے۔ان کی قادرالکلامی کا ثبوت غالب کے اس شعر سے ملتا ہے۔

غالب بفن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

شیفتہ کے عہد میں انفرادی رنگ کی شناخت جہاں شعرا کے خیال اور مضامین سے ہوتی تھی وہیں ایک ذریعۂ مخصوص تراکیب بھی ہوا کرتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اشعار میں ان تراکیب سے شعر کے حسن میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس اجتہاد نے زبان کا دائرہ وسیع کیا۔شیفتہ کی چند تراکیب بطور مثال:

تقویم سال رفتہ، اختر بخت نژند، پیمان ترک جاہ، سرناصیہ فرسا، داغ آہوئے حرم وغیرہ

ہے کارنامہ جب سے بیاض اپنی شیفتہ
تقویم سال رفتہ دیوان کلیم کا
سجدے کی کسی در پہ تمنا نہیں رکھتے
گردن پہ سرناصیہ فرسا نہیں رکھتے
شعلہ زخم سے اے صید افگن
داغ آہوئے حرم یاد آیا

بلند اور خوش آہنگ شاعر وہ ہے جس کا کلام قبول عام کی سند حاصل کرلے۔اس کے اشعار زبان زد ہوجائیں اور ضرب المثل کی شکل اختیار کرلیں۔ ہمارے شاعروں میں میر، غالب، مومن، اقبال بلاشبہہ صف اول کے ایسے شاعر ہیں جن کا کلام اس خصوصیت کا حامل ہے۔شیفتہ کے یہاں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے:

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا
فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے
وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

شیفتہ نے صنف غزل کو غزل ہی کے معنی میں برتا اور اسے زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کے اظہار کا کامیاب ترین ذریعہ بنایا۔ان کا منفرد لب ولہجہ، زبان وبیان اور انداز فکر وخیال اردو کے غزل گو شاعروں میں انھیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

□□□

Nazia Hasan
Room No. 138
Koyna Hostel
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067

عافیہ نگار

علی عباس حسینی کی تنقیدی بصیرت

علی عباس حسینی کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے انھوں نے کثیر تعداد میں افسانے اور متعدد ناولیں تحریر کی ہیں۔ اس کے شانہ بہ شانہ ان کی وسیع النظری اور عمیق مطالعہ نے انھیں تنقید کی دنیا کا ایک صاحب طرز ناقد بنا کر پیش کیا ہے۔ مگر انھیں ناقدین کی صف میں کوئی جگہ نہیں دی گئی، اگر چہ 1944 میں با قاعدہ ان کی تنقیدی کتاب اردو ناول کی تاریخ وتنقید، منظر عام پر آ چکی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین بھی برابر جریدوں کی زینت بنتے رہے، مثلاً غالب اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف، ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور، جون 1929 ''عظیم بہ زبان کلیم'' نقوش، اکتوبر 1961، ادارہ فروغ اردو، لاہور وغیرہ جس کا ذکر ڈاکٹر تہمینہ اختر نے اپنی تصنیف ''علی عباس حسینی حیات اور ادبی کارنامے'' میں کیا ہے۔

اردو ناقدین کی صف کا ایک متنازع نام پروفیسر کلیم الدین احمد کا ہے جن کی تصنیفات ''اردو شاعری پر ایک نظر'' اور ''سخن ہائے گفتنی'' انتہائی متنازع رہیں۔ اردو شاعری پر ایک نظر کے حوالے سے پروفیسر کلیم الدین احمد پر اردو ادب کے ہر گوشہ سے شدید لہجے میں احتجاج کیا گیا۔ اسی ردّ و قدح کے دور میں علی عباس حسینی نے بھی ''اردو شاعری پر ایک نظر''، ''سخن ہائے گفتنی'' کا جواب ''ہماری اردو شاعری'' لکھ کر دیا ہے۔ افسوس یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی اور اب تک شائع ہونے سے محروم ہے۔ البتہ مرثیہ کے حوالے سے لکھا ہوا باب ''تذکرہ اردو مرثیہ'' شائع ہو چکا ہے۔ تہمینہ اختر نے اپنی کتاب میں اس کے اقتباسات پیش کئے ہیں اور بھی گذشتہ برس حیدر آباد کی ایک خاتون نے ''نوحہ نگاری'' پر ایک کتاب لکھی جس میں اس کا حوالہ موجود ہے۔

علی عباس حسینی کے ان تنقیدی آثار سے قطع نظر ان کی اہم تصنیف ''اردو ناول کی تاریخ اور تنقید'' کے حوالے سے ان کے تنقیدی اسلوب کا جائزہ پیش ہے۔

تنقیدی شعور:

علی عباس حسینی کا تنقیدی شعور جن عناوین کا احاطہ کرتا ہے ان کے عنوان کچھ اس طرح سامنے آتے ہیں:

*صاحبان قلم پر تنقید *تصانیف اور مواد پر تنقید *سماج پر تنقید

*مغربی سماج پر تنقید *مشرقی یا ہندوستانی سماج پر تنقید

قلمکاروں پر تنقید:

علی عباس حسینی نے اپنی تصنیف ''اردو ناول کی تاریخ اور تنقید'' میں نہ صرف اردو صاحبان قلم پر اپنی آراء ظاہر کی ہے بلکہ ناول نگاری کے حوالے سے مغرب کے بہت سے قلمکاروں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے اوران کی اچھائیوں یا خامیوں کو واضح کیا ہے۔اس حوالے سے دو ایک مثالیں پیش کی ہیں۔

انقلاب فرانس سے ناول پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مغرب میں ناول کے ارتقائی منازل اور ان کے اقسام پر بہت جامع روشنی ڈالی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ:

''انگلستان کے ادیبوں نے تین طرح کے ناولوں کی بنیادیں رکھیں۔ والپول نے گوتھک یا اسراری ناول لکھے۔ سر والٹر اسکاٹ نے وہ تاریخی ناول لکھے جو یورپ امریکہ اور ایشیا میں تاریخ بینی کے شوق کے بانی بنے اور جین آسٹن نے وہ معاشرتی ناول لکھے جنھوں نے فرد و جماعت کے حقوق و فرائض پر بحث کو ناول کا مخصوص موضوع بنادیا۔

مغرب کے صاحبان قلم کے ذریعہ پیش کردہ ''ناول'' کی تعریف کا جائزہ لیتے ہوئے جس طرح ان تعریفوں کی خامی وخوبی پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے وہ گفتگو آپ کی دروں بینی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔علی عباس حسینی نے ابتدائی عہد کے مشہور مغربی صاحبان قلم ڈینیل ڈیفو، فیلڈنگ، اسمولٹ اور اسٹولن کی پیش کردہ تعریفوں کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

''یہ تعریف بھی فیلڈنگ کی تعریف کی طرح ناقص ہے، اس لئے کہ اس میں سارا زور پلاٹ پر ہے نہ کہ کردار پر۔ہم کردار کو واضح کرنے کے لئے پلاٹ بناتے ہیں نہ کہ پلاٹ کو بنانے کے لئے کردار۔مگر اسمولٹ اس زمانہ کا مصنف ہے جب صرف رزمیہ اور رومانی ناول وجود میں آئے تھے اور جب کرداری ناول نے جنم لیا تھا۔اس لئے وہ قابل حرف گیری نہیں،البتہ تعجب ہوتا ہے اسٹونس پر کہ وہ عہد وکٹوریہ کا مصنف ہونے کے باوجود ناول کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے''

(علی عباس حسینی اردو ناول کی تاریخ اور تنقید،صفحہ 36)

انگریزی کے ناول نگاروں کا عہد بہ عہد جائزہ لیتے ہوئے سبھی ناول نگاروں کی اچھائیوں اور برائیوں کا نہایت جامع جائزہ پیش کیا ہے، مثلاً عہد ایڈورڈ اور عہد جارج کے مشہور ناول نگار جیمس جوائس [(علی عباس حسینی،اردو ناول کی تاریخ اور تنقید،صفحہ 37)] کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جوائس کے مداح، خواہ کچھ بھی کہیں لیکن اس کی کتابیں نہ تو عام پسند ہوسکتی ہیں اور نہ پڑھے لکھے لوگ ہی ان سے بغیر ایک بڑے لغت کی مدد کے کماحقہ لطف اندوز ہوسکتے ہیں اور بعد کی تصنیفات میں سے بعض تو ایسی زبان میں لکھی گئی ہیں جو محض انگریزی داں حضرات کی بساط سے باہر ہے اور ان کے سمجھنے کے لئے یورپ کی نصف درجن زبانوں سے واقفیت ضروری ہے'' (ایضاً صفحہ 126-127)

علی عباس حسینی نے اپنی تصنیف کے تیسرے باب میں جس طرح انگریزی ادب میں ناول کے فروغ اور اس کے اہم صاحبان قلم کا جائزہ لیا ہے اس میں بڑے اور چھوٹے سبھی اہل قلم زیر بحث آئے ہیں اگرچہ وہ خود اس بات کے مُقر نہیں کہ:

''اختصار مدنظر ہے ورنہ بیسیوں اور بھی معمار ہیں جنھوں نے ناول کے عظیم الشان مینار کی تعمیر میں حصہ لیا ہے''

(علی عباس حسینی،اردو ناول کی تاریخ اور تنقید،صفحہ 132)

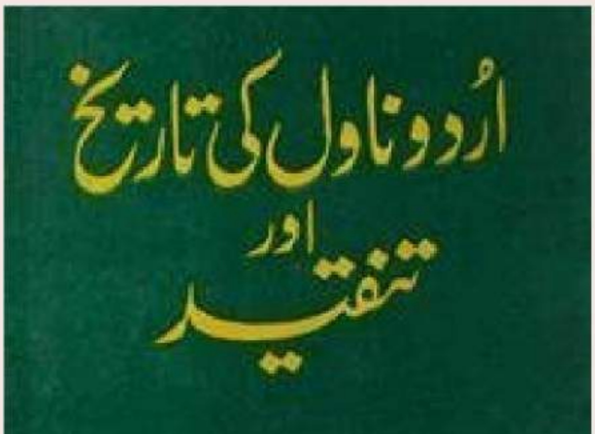

اور اس طرح ناول نگاروں کی ایک بڑی تعداد تحلیل و تجزیہ سے رہ گئی ہے۔اس کے باوجود متعدد مشہور و معروف ناول نگاروں کا ذکر کیا ہے مثلاً: بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں امریکہ کے مشہور ناول نگار سنکلر لوئس

نے کافی شہرت حاصل کی جس کی ابتداء ''مین اسٹریٹ'' سے ہوئی۔1922 میں اس نے ''بے بٹ'' 1925 میں ''ریرواسمتھ'' 1928 میں ''اکمر گینٹری'' اور 1929 میں ''ڈوڈس ورتھ'' تحریر کی۔لیکن علی عباس حسینی ان سبھی تحریروں سے مطمئن نظر نہیں آتے اور لکھتے ہیں:

''ان پچھلے پندرہ برسوں میں لوئس نے کوئی ایسی چیز پیش نہیں کی جو اس کے شان ہو۔غالباً نوبل انعام پانا ہی اس کی منزل مقصود تھی اور اس کے حاصل ہوتے ہی وہ ایک تھکے ہارے مسافر کی طرح آرام کی نیند سو گیا''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، صفحہ 129-130)

ناول نگاروں کا جائزہ لیتے ہوئے علی عباس حسینی ایچ۔جی۔ویلز کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''ایک خاص بات جو ویلز کی تصنیفات سے ظاہر ہوتی ہیں وہ یہ ہے کہ وہ موجودہ سوسائٹی سے غیر مطمئن ہے اور اسے بہتر سے بہتر بنانا چاہتا ہے وہ کمیونسٹوں کی طرح پولتاریہ کی حکومت پر تو یقین نہیں رکھتا لیکن وہ خاص طرح کے انقلاب کا حامی ضرور ہے۔دی ورلڈ آف ولیم کلیولڈ میں وہ ایک ایسے دور کی پیش گوئی کرتا ہے جس میں سب سے بڑا سائنس داں اس کا آمر ہوگا''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، صفحہ 17)

اسمولٹ کے سلسلہ میں علی عباس حسین کا تاثر ہے کہ:

''اسمولٹ اپنے ہم عصروں میں سب سے کم درجہ کا ناول نگار ہے اس لئے کہ وہ نقال ہے۔اس میں مادہ تخلیق بہت کم ہے، لیکن اس نے انگریزی ناول کے دامن کو وسیع کیا اور سب سے پہلی بار انگریزی کرداروں کو انگلستان سے نکال کر اسکاٹ لینڈ اور فرانس کی سیر کرائی اور وہاں کے حالات و اطوار پیش کئے''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، صفحہ 84)

علی عباس حسینی نے مغربی ناول نگاروں کے فکری آثار کا جائزہ طویل اور مختصر دونوں انداز سے لیا ہے۔

اردو صاحبان قلم پر تنقید:

علی عباس حسینی نے جہاں ایک طرف انگریزی صاحبان قلم پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اسی کے شانہ بہ شانہ ناول نگاروں کا بھی ان کی تصنیفات کے حوالے سے جائزہ لیا ہے، اس سلسلہ میں ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر، منشی پریم چند، عظیم بیگ چغتائی، الطاف حسین حالی، شاد عظیم آبادی، طیب، انشاء اللہ خاں انشاء، مرزا محمد ہادی رسوا وغیرہ جیسے اہل قلم ان کے تحلیل و تجزیہ کے دائرہ کار میں نظر آتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نذیر احمد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام قصوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی بالکل سچی تصویر کشی کی ہے۔انھوں نے جن پری، بھوت، پریت جادو طلسم کے سے غیر انسانی عناصر کو ترک کر کے اپنے گرد و پیش کے لوگوں اور اپنی ہی طرح کے معمولی انسانوں کے حالات بیان کئے ہیں۔ان کے پلاٹ سادے اور مختصر ہیں۔ان میں نہ تو تحریک ہے اور نہ تفویق پھر مصنف ہر موقع پر واعظ بھی ہے اور ناصح بھی۔لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود وہ حقیقت نگار ہیں اور اردو کے بہت بڑے مکالمہ نویس''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، صفحہ 154)

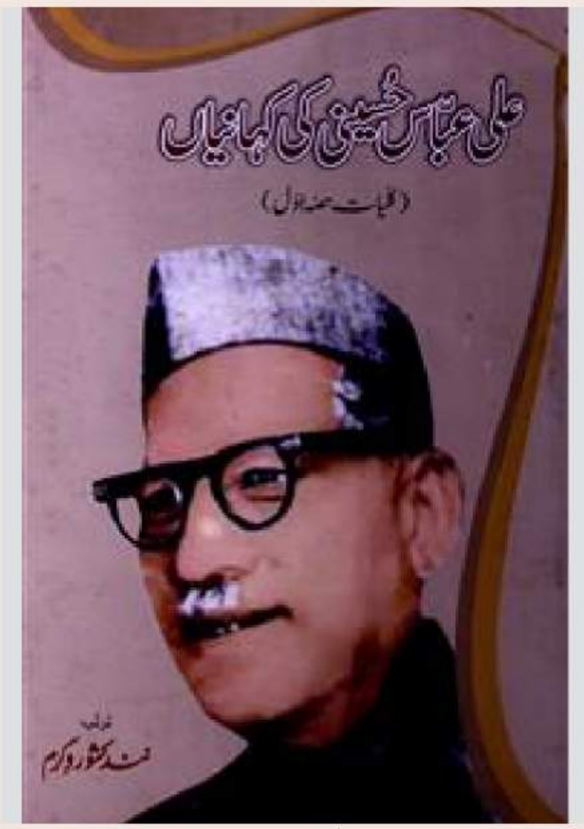

پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''ساری کتاب بہترین مکالموں سے بھری پڑی ہے۔سرشاد

اس کا بادشاہ ہے۔ انگریز ہو یا ہندوستانی، دیہاتی ہو یا لکھنوی، وہ ہر ایک کے انداز تکلم سے واقف ہے۔ کیا مجال جواب ولہجہ میں ذرہ بھر فرق آ جائے۔ بیگموں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ، ماما، دائیوں کی ہنسی ٹھٹول، ساقنوں کی گالی گلوج، سحر پر مولوی صاحب کا لکچر سب کے سب اپنے محل سے بیش قیمت نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ جن مقامات کا ذکر کیا گیا ہے اور جہاں کی طرز معاشرت کا خاکہ کھینچا گیا ہے وہ ہو بہو وہیں کا ہے۔ پورا پلاٹ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس طرح کے آئے دن واقعات ہوتے رہتے ہیں اور پورے قصہ کا کوئی جز وایسا نہیں ہے جس میں شک کیا جائے یا جو کہیں سے غیر فطری ہوا ہو۔ یہ ناول ہر طرح اس قابل ہے کہ اسے اردو ادب میں صف اول میں جگہ دی جائے گی'' [

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، صفحہ 229)

اردو کے مشہور صاحب قلم مولانا عبدالحلیم شرر کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے نہ فقط مولانا شرر کا جائزہ لیا ہے بلکہ ان کے حوالے سے تمام تاریخی ناول نگاروں کی تخلیقات کا محاکمہ کیا ہے، علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

''ان کے تاریخی ناول ہی لے لیجئے ان کے بارے میں آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے اکثر شخصیتوں اور کرداروں کے انتخاب میں غلطی کی ہے۔ ناول کی جگہ وہاں ہوتی ہے جہاں تاریخ کے صفحے سادے ہوں۔ امتداد زمانہ کی وجہ سے جن واقعات کے نقوش مٹ گئے ہیں یا جو شخصیتیں دھندلی پڑگئی ہیں انھیں ناول اجاگر کرکے پیش کر سکتا ہے لیکن جہاں تاریخ کا آفتاب عالم تاب خود ہی نصف النہار پر چمک رہا ہو وہاں ناول کی شمع جلانا آپ اپنا مضحکہ کرانا ہے۔

سچ فرمایا ہے پروفیسر ڈاوڈن نے کہ تاریخی مضامین کے بیان میں ہر طرح کی خلاف واقعہ چیزیں الگ کر دینا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ کالپری نیڈ، رینالڈس، محمد علی طیب اور مولانا عبدالحلیم شرر کی تصنیفات ان سب کے ہاں ہیرو اور ہیروئن کے نام تو تاریخی ہوتے ہیں لیکن ان کے کردار وخیال مصنف کے عطا کردہ''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید۔ صفحہ 231-232)

عبدالحلیم شرر کی تخلیقات کے صرف معائب ہی بیان کیے ہیں بلکہ مولانا کی اچھائیوں کو بھی اس ولولہ سے سراہا ہے اور مولانا کی لغزشوں کا دفاع بھی کیا۔

''فردوس بریں'' کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سلسلہ میں شرر نے جو مکالمے حسین اور شیخ کے درمیان مختلف مسائل پر لکھے ہیں وہ اپنی مثال ہیں۔ حق یہ ہے کہ مولانا اسلامی مذہبیات کے ماہر تھے اور اس لئے وہ علمائے مذہب کے طرز تکلم اور انداز استدلال کا چربہ بہت ہی خوبی سے اتار لیتے تھے''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید۔ صفحہ 236)

اردو کے مشہور ناول نگار جنھیں ہندی ادب میں اوپنیاس سمراٹ کا لقب دیا گیا ہے ان پر اظہار رائے کرتے ہوئے علی عباس حسینی نے پریم چند پر ان کی ہر تصنیف کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور ان کی تعریف وتوصیف میں کسی طرح کی خست نہیں کی ہے۔ ''بیوہ'' پر اپنی رائے ان لفظوں میں ظاہر کی ہے:

''قصہ اخلاقی ہے اور بہت حد تک حقیقت سے ہٹا ہوا پھر بھی پریم چند کے جادو نگار قلم نے ''امرت رائے'' اور ''پریما'' کی ذہنی الجھنوں اور قلبی پریشانیوں کی بڑی اچھی تحلیل پیش کی ہے'' (علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، صفحہ 295)

پریم چند کے ایک اور اہم ناول ''نرملا'' میں نرملا کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے علی عباس حسینی لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس کردار کو جس طرح بے بس و مجبور دکھایا ہے اس کا اثر قاری پر اتنا ہی شدید الٹا ہوتا ہے۔ علی عباس حسینی کے الفاظ میں:

''لیکن اس کی اس بے بسی اور بے حسی کا اثر ناظرین پر الٹا پڑتا ہے۔ وہ انسان کو اس طرح پتھر بنا دینے والے مظالم کی داستان سن کر چیخ اٹھتا ہے اور یہی مصنف کی کامیابی ہے۔''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید۔ صفحہ 297)

علی عباس حسینی پریم چند کی اہم تصنیف ''گئودان'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پریم چند کی تصنیفات میں ایک اور کمی ہے۔ انھوں نے سوائے تنخا کیکوئی ایسی سیرت نہیں پیش کی جس میں ابدیت کی علامات ہوں۔ کسانوں اور ان کے لیڈروں کے کردار ہمیشہ رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ ہی دنوں بعد نظام سیاسی بدل جائے اور دیہاتی اور شہری زندگی دوسرے ڈھانچے میں ڈھال دی جائے۔ ایسی حالت میں پریم چند کے ناول محض تاریخی بن کر رہ جائیں گے۔ ان کے کسی کردار

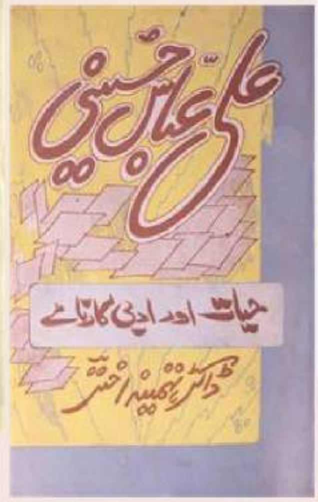

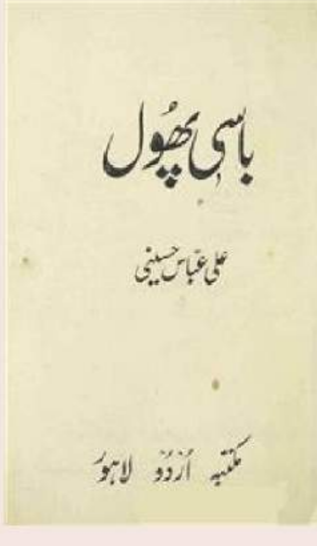

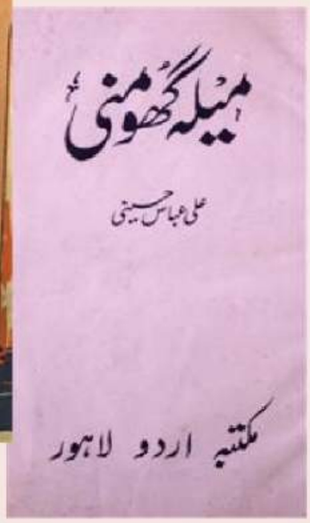

کا نام ہماری زبان پر طرح نہ آئے گا جس طرح عمرو، عیار، شیخ چلی، حاجی بغلول، احمق الذی، مہر جان، امراؤ جان اور نانی عشو کے نام آتے ہیں۔ ٹخا میں اس کی صلاحیت تھی کہ وہ اس فہرست میں شامل کیا جائے لیکن مصنف نے اس پر سرسری نظر ڈال کر اسے گنؤ دان میں بہت ہی کم حصہ دیا، چنانچہ وہ باقی تو ضرور رہے گا لیکن نیم مردہ سا۔''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید۔ صفحہ 307، 308)

علی عباس حسینی نے اردو اور ہندی کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کا تنقیدی جائزہ پیش کیا تھا۔ تنقید و تجزیہ کے اگلے مرحلہ پر اردو فکشن کے ایک اور صاحب قلم عظیم بیگ چغتائی کے سلسلے میں وہ اپنی آراء ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں:

''ان کے اور بھی ناول ہیں مثلاً ''ویمپائر''، ''فل بوٹ''، ''شہ زوری''، ''قصر صحرا''، ''کمزوری''، ''تفویض'' اور ''جنت کا بھوت'' لیکن ان کی تصنیفات میں سے صرف دو ہی باقی رہیں گی۔ ایک تو ''خانم'' دوسری ''چمکی''۔ ''خانم'' اس لئے کہ اس میں مصنف نے اپنے خاندان کی اس طرح مرقع کشی کی ہے کہ اس کا اطلاق اوسط طبقے کے پڑھے لکھے ہر مسلمان گھر پر ہوتا ہے اور ''چمکی'' اس لئے زندہ رہے گی کہ اس میں جنگلی گلاب کی سادگی، وفاداری، معصومیت اور کشش کا جواب نہیں۔ اس کی اپنے عالی جاہ سے والہانہ محبت اور اس سلسلہ میں اس کے مضحک مگر دل پر نشتر لگانے والے حرکات اس بلا کا جذب اس کردار میں بھر دیتے ہیں جو اردو کی کسی ہیروئن کو آج تک نصیب نہ ہوا۔ اگر بہ قول عصمت ''چمکی'' کی تخلیق عیاشی ہے تو خدا کرے کہ ہم سب اس طرح کی عیاشی میں مبتلا ہو جائیں۔''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید۔ صفحہ 339)

اردو صاحبان قلم کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے علی عباس حسینی نے بہت سے ناول نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ ان سب کا ذکر تو ممکن نہیں لیکن اس پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر مرزا محمد سید اور مرزا محمد ہادی رسوا مفکر ہیں اور حیات انسانی کے ہر پہلو کو فلسفیانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ زبان و بیان اور اسلوب کے نقطۂ نظر سے رسوا اور پریم چند کو محمد سعید پر فوقیت حاصل ہے، لیکن جہاں تک تمام فنون لطیفہ کا سوال ہے اس میدان میں سعید کا کوئی مد مقابل نہیں اور اس طرح سعید پریم چند اور رسوا سے سبقت لے جاتے ہیں۔ اگر چہ رسوا اور پریم چند دیگر فنون لطیفہ سے واقف تھے لیکن وہ صرف موسیقی زیر بحث لائے جب کہ مرزا محمد سعید نے ''خواب ہستی'' میں دیگر فنون پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مگر ''یاسمین'' کے ذیل میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں کہ:

''مصوروں اور ان کے شاہکاروں کا جمگھٹ ہے۔''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، صفحہ 320)

□□□

Afiya Nigar
D/o. Abdul Barik
Qasimabad, Ghazipur-(U.P)
Mob: 9616353500

ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی

سردار خانم مخفی امروہوی

'متاعِ مخفی' کی خالقہ سردار خانم مخفی، امروہہ کے معروف علمی و تہذیبی اور مذہبی گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے والد گرامی مولوی سردار احمد خاں صاحب یوسف زئی مرحوم (وفات: 13 جنوری 1981) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اور مسلم تہذیب و شائستگی کا اعلیٰ نمونہ اور عمائدین شہر میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ اشاعتِ تعلیم اور علوم مشرقی سے خاص دلچسپی ہونے کی وجہ سے طویل عرصہ تک دارالعلوم اسلامیہ عربیہ چلہ امروہہ کے صدر مہتمم رہے اور اس علمی ادارے کی بے لوث خدمات انجام دیں۔ تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ اپنے قلم میں کبھی مدرسہ کی روشنائی تک استعمال نہیں کرتے تھے۔

میں طبعاً عورتوں کی تخلیقات کی طرف سے زیادہ خوش فہم نہیں ہوں کیونکہ ان میں اکثر کے یہاں سب کچھ ہونے کے باوجود ایک طبعی کمی یا کمزوری ضرور رہتی ہے، اس لیے میں نے شاعرات کو کبھی زیادہ پڑھا بھی نہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانہ میں سب سے پہلے مغل شہزادی زیب النساء بیگم (وفات: 1701) بنت اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ نے اپنے اردو فارسی کے بہت سے اشعار سے محظوظ کیا تھا۔ ان کا ایک شعر اس وقت بھی یاد آرہا ہے

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

اس کے بعد صرف پاکستان کی شاعرہ پروین شاکر کو پڑھا اور ان کے کلام سے بالخصوص ان کے نسوانی انداز سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور اسی تاثر کے سبب ان کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ بھی کیا۔ آج بھی ان کے بہت سے شعر زبان پر آجاتے ہیں اور دیر تلک ذہن و دل کو اپنے تاثر میں باندھے رکھتے ہیں۔ یہاں ان کے کچھ منتخب شعر نقل کرنا محض طوالت کا باعث ہوگا۔

کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ امروہہ کے کسی سخن شناس نے محترمہ مخفی صاحبہ کا یہ شعر سنایا

جذبۂ عشق مزا تو جب ہے
مجھ کو وہ جانِ زمانہ ڈھونڈے

تو زبان سے بے ساختہ واہ کیا بات ہے، نکلا اور دیر تک اس شعر کی بے ساختگی، زبان کی صفائی، تغزل کی چاشنی اور جذبۂ عشق کی فراوانی سے لطف اندوز ہوتا رہا اور اس غزل یا مخفی صاحبہ کے مزید اشعار سننے کے لیے ''ھل من مزید'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ''دِرِروَف'' جا پہنچا۔ جہاں جناب ڈاکٹر مرزا احمد حسین صاحب سیفی امروہوی (متوفی: 3رمئی 2012) نے ان کے کئی اشعار کے ساتھ ان کی نعت پاک کے بھی بہت سے شعر سنائے۔ سیفی صاحب کے سنائے شعروں میں یہ دو شعر آج بھی میرے ذہن و دل پر نقش ہیں:

وہ تصور میں جب نہیں ہوتے
روز و شب روز و شب نہیں ہوتے
لوگ جو غم میں ساتھ دیتے ہیں
پہلے ہوتے تھے اب نہیں ہوتے

یہ شعر تمام تر فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ سہل ممتنع کی بھی بہترین مثال ہیں۔

27رنومبر 2005 کی رات کو مرزا ساجد حسین صاحب ساجد امروہوی کے دولت کدہ پر ان کے بڑے بھائی جناب مرزا حامد حسین حامد امروہوی مقیم امریکہ، سے اپنے تذکرہ ''شعرائے امروہہ'' (جلد دوم) کے لیے سوانحی کوائف دریافت کرنے کی غرض سے ملاقات کرنے گیا تو ساتھ ہی وہاں محترمہ سردار خانم مخفی امروہوی سے بھی ملاقات ہوئی اور محسوس ہوا کہ آج، آگ لینے آئے تھے اور پیغمبری مل گئی۔ میں ان کی شاعری سے زیادہ ان کی شخصیت سے متاثر ہوا اور محسوس کیا کہ بڑے لوگ یونہی بڑے نہیں ہوجاتے، ان کے عادات واطوار واخلاق وسیرت میں وہ بہت ساری خوبیاں ہوتی ہیں جن کے سبب اللہ رب العزت بھی انھیں بے پناہ صلاحیتوں سے نواز دیتا ہے۔ دورانِ گفتگو ان کے ہر ہر لفظ سے ذہانت وشرافت، شائستگی و برجستگی، وقار و متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ہی بے لوث ہمدردی اور اپنائیت و محبت ٹپک رہی تھی۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہونے کے بعد ان کی شاعری پر بات شروع ہوئی۔ انھوں نے اپنے بہت سارے عمدہ عمدہ شعر سنا کر نہ صرف اپنی فنی خوبیوں اور شعر گوئی میں کلاسیکی رچاؤ سے مجھے معترف کرلیا بلکہ میں نے ان کے ایک دو شعر پر یہ بھی کہا کہ پروین شاکر سے آگے کی بات کہی ہے۔ اسی شعر و شاعری میں رات کے بارہ بج گئے تو میں احتراماً آنے لگا اور ان کے شوہر نامدار الحاج مرزا حامد حسین صاحب حامد امروہوی سے کل پھر ملاقات کرنے کی درخواست کی۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے کل رات نو بجے حاضری کی اجازت دی۔ میں وقت مقررہ پر حاضر ہوا تو انھوں نے جاتے ہی میرے سامنے محترمہ سردار خانم مخفی امروہوی کا غیر مطبوعہ مجموعۂ کلام ''متاعِ مخفی'' کے نام سے مجھے یہ کہہ کر دیا کہ ''لیجیے آپ اس کا مطالعہ کرکے اس پر ایک مقالہ لکھیں۔'' یہ بات میرے وہم وگماں سے بھی پرے تھی کہ میں ایک ایسی متاعِ مخفی کی کیا پردہ کشائی کرسکتا ہوں جس کا ہر ہر شعر کئی کئی پہلو لیے ہوئے ہے۔ بہرحال حکمِ بزرگاں کے تحت میں نے ''متاعِ مخفی'' پر قلم اُٹھانے کی جرأت کی۔ دیر تک تو مجموعۂ کلام کے تخلص کی مناسبت سے نام پر ہی مسرور وحیرت زدہ رہا اور ان دونوں میاں بیوی کی ذہانت کا قائل ہوگیا کہ ''متاعِ مخفی'' میں کتنی معنویت اور تہہ داری پیدا کی ہے۔ ''خدا کے فضل سے میاں بیوی دونوں ہی.....؛

گھر آکر ''متاعِ مخفی'' کا مطالعہ شروع کیا تو اس کے مخفی خزانے مجھ پر منکشف ہوتے گئے، میری یہ عادت ہے کہ جب مجھے کسی شاعر پر کچھ لکھنا ہوتا ہے تو اس کے سارے موجود کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرتا ہوں اور تمام پسندیدہ اشعار پر نشان لگا لیتا ہوں۔ جب میں نے اس پر لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا تو چند تمہیدی جملوں کے بعد دیکھا کہ ''متاعِ مخفی'' کے اکثر اشعار پر صحیح کا نشان ہے۔ مجموعۂ کلام کے ہر ہر شعر نے اپنے اپنے انداز سے دل کھینچا تھا بالکل نظیری نیشاپوری کے اس شعر کے مصداق کہ

از قدم تا بہ فرق ہر کجا کہ می نگری
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

اور یہ سوچ کر قلم رکھ دیا کہ شاید میں اس ''متاعِ مخفی'' کا حق ادا نہیں کرسکوں گا۔ صبح اُٹھ کر اپنے معمولات سے فارغ ہوکر اسکول چلا گیا؛ لیکن اسکول میں تمام دن اسی تاثر میں ڈوبا رہا اور مخفی صاحبہ کا وہ بے تکلفانہ انداز نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ ''دیکھ یوں کہتے ہیں سخنورسحرا'' اور ان کے بہت سے اشعار کو جو رات کے مطالعہ سے ذہن نشین بلکہ دل میں جاگزیں ہوگئے تھے، گنگناتا رہا۔ شام کو گھر آیا تو حامد صاحب سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر مغرب کی نماز کو گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد پھر ''متاعِ مخفی'' کو ایک نئے حوصلہ اور عزم کے ساتھ یہ سوچ کر اُٹھایا کہ جیسا بھی لکھ سکتا ہوں، لکھ دینا ہی چاہیے۔ تعمیل حکم کا یہی تقاضہ ہے۔ اسی دوبارہ ورق گردانی کے دوران نعت پاک کے ان اشعار پر نظر پڑی:

میرا ہونا وجہ زحمت تھا جہاں
اب وہاں میں وجہِ رحمت ہوگئی

رحمت اللعالمینؐ کے فیض سے
دو جہاں میں میری عزت ہوگئی
بزم ہستی میں ہوں وجہِ افتخار
کیسی اچھی میری قسمت ہوگئی
پہلے زندہ دفن کر دیتے تھے لوگ
اب میرے قدموں میں جنت ہوگئی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسل انسانی پر لاکھوں احسانات ہیں جس میں سے عورتوں پر بھی ایک عظیم احسان یہ ہے کہ آپ نے اسلام میں عورت کو وہ مقام و مرتبہ عطا فرمایا کہ آپؐ سے پہلے یا آپؐ کے بعد کسی مذہب، کسی اصلاحی تحریک اور کسی بھی انفرادی و سماجی تنظیم نے عورت کو یہ شرف عطا نہیں کیا۔ رحمت عالمیان، آقائے دو جہان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں سب سے پہلے، باپ کی جائیداد میں عورت کا حصہ مقرر فرمایا (یعنی تہائی) عورتوں کے بارے میں پروین شاکر نے اپنے شعری مجموعہ ''صد برگ'' میں کیا خوب تبصرہ کیا ہے۔

میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک ایسے قبیلے (عورت) میں پیدا ہوئی جہاں سوچ رکھنا جرائم میں شامل ہے مگر قبیلے والوں سے بھول یہ ہوئی کہ انھوں نے مجھے پیدا ہوتے ہی زمین میں نہیں گاڑا اور اب مجھے دیوار میں چن دینا ان کے لیے اخلاقی طور پر اتنا آسان نہیں رہا۔''

مخفی امروہوی نے حمد و نعت اور منقبت کے ساتھ ہی غزل میں اپنی طبع نازک کے جوہر دکھائے ہیں اور غزل کے مدھم لہجے مسرور کن انداز کو اور بھی جلا بخشی۔ جناب سید محمد حنیف اخگر ملیح آبادی نے آپ کی غزل کا بہت اچھا تعارف پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مخفی نے توکل علی اللہ اور عظمتِ انسانیت کو مدِ نظر رکھ کر عرفانِ ذات، عرفانِ حیات، رواداری، رشتہ داری، آبائی وطن کی مٹی سے دائمی وابستگی، کردار کی نفاست، ایمان کی پختگی، امورِ خانہ داری، استواریٔ شیرازۂ خاندان، آل اولاد کے لیے منازل ارتقائی اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے دلی تمناؤں اور دعاؤں جیسے انسانی احساسات و تجربات حیات کو غزل کی نرم آغوش مہیا کرائی ہے۔''

انھوں نے پوری طرح اپنے احساسات کو غزل کا جامہ پہنایا ہے ان کی غزل میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک عمدہ غزل میں ہونی چاہئیں۔ مخفی صاحبہ کی پرورش اور تعلیم و تربیت امروہہ جیسے علم پرور ماحول میں ہوئی۔ اس لیے انھیں زبان پر اچھی قدرت ہے اور اس کا انھیں خود بھی احساس ہے کہ اپنی بات کہنے کے لیے زبان کیسی صاف وشائستہ اور رواں ہونی چاہیے، ان کا ایک شعر ہے کہ:

مصحفی کی زباں زباں ہے میری
گفتگو میں مری شرافت ہے

واقعی غلام ہمدانی مصحفی بھی زباں کے شاعر تھے، انھوں نے بھی اپنی زباں کے بارے میں کہا ہے

سب بدن لے گئے زمیں میں ہم
مصحفی اک زبان چھوڑ گئے

ایک اچھی اور عمدہ غزل کہنے کے لیے زبان پر قدرت بھی از بس ضروری ہے جو سردار خانم مخفی امروہوی کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مخفی صاحبہ نے چھوٹی چھوٹی سامنے کی باتوں کو اس طرح غزل کے نازک پیکر میں تراشا ہے کہ ان کی چابک دستی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ دیکھیے بالکل سامنے کے مضامین ہیں؛ لیکن انھوں نے کس خوبصورتی اور فن کاری سے انھیں شعری سانچے میں ڈھالا ہے:

بات کہنے کو برملا کہہ دوں
خوف ترکِ تعلقات کا ہے

اور خالص غزل کے شعر دیکھیے

وہ منانے سے کہاں مانے گا
روٹھنے کا جو بہانا ڈھونڈے

اور یہ اشعار کیا خوب ہیں جو ہماری کلاسیکی غزل کی جان ہیں

دل تری بزم میں جانے کے لیے
روز اک تازہ بہانہ ڈھونڈے
قسم نہ کھا یہ مرا دل ہے اس کی تسکین کو
فقط زباں کا تری اعتبار کافی ہے
ڈر اگر ہے تو فقط عشق کی رسوائی کا
ورنہ قاتل جو مرا ہے مری پہچان میں ہے
جذبۂ عشق مزا تو جب ہے
مجھ کو وہ جانِ زمانہ ڈھونڈے
حال مخفی کا سب پہ ظاہر ہے
کاش وہ بھی سمجھ گیا ہوتا

اب مضمون کی طوالت کے خوف سے بغیر کسی تبصرہ کے اپنے کچھ منتخب و پسندیدہ اشعار یہاں پیش کرتا ہوں:

شاعری میری کیا ہے اے مخفی
دل کی آواز لب پہ آئی ہے

بلاشبہ از دل خیزد بر دل ریزد والی بات ہے جب یہ محترمہ مخفی صاحبہ کے دل کی آواز ہے تو ہمارے دلوں پر بھی اثر کرتی ہے:

ڈال کے میں نے ہر اک سمت ہنسی کے پردے
دل کے زخموں کو زمانے سے چھپا رکھا ہے
غم ہائے روزگار سے فرصت اگر ملی
مخفی ادا کروں گی زمانے کا شکریہ

اور یہ شعر بطور خاص ملاحظہ کریں:

خدا کا شکر ابھی تک تو مان باقی ہے
پرانے شہر میں اپنا مکان باقی ہے

اور حمد خداوندی میں یہ شعر کس قدر خوبصورت اور سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے:

شکر اس کا ادا نہیں ہوتا
ورنہ ہونے کو کیا نہیں ہوتا

مخفی صاحبہ اگر مسلسل مزاح میں بھی شعر کہتیں تو امروہہ کی طنز ومزاح گوئی کی روایت میں ایک اور خوبصورت، باوقار نام کا اضافہ ہوتا۔ دیکھیے مزاح میں ان کے یہ چند شعر

اس کی برائی لاکھ زمانہ کرے مگر
مخفی مرا، میاں مجھے اچھا دکھائی دے
وہ جان بوجھ کے آنے میں دیر کرتے ہیں
مگر یہ کہتے ہیں پیچھے مری گھڑی ہوگئی
برا کیا تو برائی کا پھل ملے گا ضرور
یہاں نہیں تو قیامت میں کرکری ہوگی
اس میں خطا کنوئیں کی نہ رسّی کا کچھ قصور
لٹیا خود اپنے آپ ڈبوئے ہوئے ہیں ہم

اسی طرح کے اور بھی بہت سے اشعار ''متاعِ مخفی'' کی زینت ہیں جو بھر پور طنز ومزاح کے ساتھ ہی ساتھ پوری متانت اور شائستگی سے لبریز ہیں۔ سردار خانم مخفی امروہوی کے اشعار میں ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ کہیں کوئی رکیک پہلو یا پھکڑ پن نہیں ہے۔ مخفی صاحبہ کے یہاں اپنے وطن سے بھی بے پناہ محبت اور لگاؤ ہے۔ معاشی مجبوریوں کے تحت انھوں نے اپنے وطن عزیز کو چھوڑا؛ لیکن اس کی جدائی آج بھی انہیں پریشان رکھتی ہے۔ وہ کہتی ہیں:

زباں سے کہیں کیا یہ دل جانتا ہے
کہ کس دل سے ہندوستاں چھوڑ آئے

تقسیم وطن کے بارے میں ان کا یہ شعر کس قدر بلیغ اور خوبصورت ہے

گردشِ وقت کی نے رنگیاں ہم سے پوچھو
ہم نے دیکھا ہے گلستاں کو بیاباں ہونا

''متاعِ مخفی'' میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے جذبات کی فراوانی، قومی یکجہتی کی ترویج واشاعت بھی خوب خوب جلوہ گر ہے۔ دیکھیے چند اشعار:

نفرت کرو نفرت سے، کدورت کو بھلا دو
لگ جاؤ گلے چھوڑو گلا، عید کا دن ہے

یا یہ اشعار:

پیدا وہ حالات کریں
صبح جیسی رات کریں
دل کی کلی جس سے کھِل جائے
ایسی کوئی بات کریں
ہم تو شام کو صبح بنائیں
خواہ وہ دن کو رات کریں

سردار خانم مخفی امروہوی کے اسی طرح کے اور بہت سے اشعار ہیں جو ان کی شاعری کے کینوس کو بہت بڑا کر دیتے ہیں اور بلاشبہ وہ دور حاضر کی بڑی شاعرات میں ایک ممتاز ومنفرد مقام کی حامل ہیں۔

آخر میں، میں انھیں اور ان کے شوہر، عالی جناب الحاج مرزا حامد حسین صاحب حامد امروہوی کو اس ''متاعِ مخفی'' کے چھپے ہوئے خزانہ کو آشکار کرنے یعنی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت یہ ''متاعِ مخفی'' ہماری نئی نسل کے لیے ایک متاعِ بے بہا ثابت ہو اور مخفی صاحبہ کا یہ حوصلہ ہمیشہ اسی طرح بلند رہے۔ بس اپنی بات ان ہی کے ایک شعر پر مکمل کرتا ہوں

پھر پھول کھلانے ہیں صحراؤں میں اے مخفی
نفرت کو محبت کے دریا میں ڈبونا ہے

□□□

Dr. Misbah Ahmad Siddiqui
Gher Manaf
Amroha-244221 (U.P)

پروفیسر اسلم جمشید پوری

نادیدہ بہاروں کے نشاں

اردو میں خصوصاً اکیسویں صدی میں ناولٹ کم تحریر ہوئے ہیں۔یا یوں کہیں کہ ناولٹ تو بے شمار لکھے گئے مگر انھیں ناول کا نام دیا گیا۔لہٰذا وہ ناولٹ کے بجائے ناول کے زمرے میں شمار ہوئے۔اگر یہ سبھی ناول، ناولٹ کے زمرے میں آتے،تو آج ناولٹ کی صنف کو ناول کا محتاج نہ ہونا پڑتا۔ایسے ہی ناولوں میں ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' کا شمار ہوتا ہے،جو ہر اعتبار سے ایک عمدہ ناولٹ ہے۔

شائستہ فاخری کے قلم کا شاہکار ناولٹ ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' سماج کے ایک سلگتے ہوئے مسئلے پر مرکوز ہے۔یعنی ناولٹ کا موضوع طلاق اور حلالہ ہے۔ناولٹ نگار نے موضوع کو نبھانے میں کوئی کور کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔بلکہ شائستہ فاخری نے اپنے اس ناولٹ کے ذریعہ تانیثیت کو بھی نئے زاویے سے پیش کیا ہے۔شائستہ فاخری نے اپنے قلم کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ قاری انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اور اس کے اندر عورت سے نہ صرف ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے، بلکہ وہ طلاق اور حلالہ کو بھی الگ زاویے سے دیکھنے لگتا ہے۔

شائستہ فاخری نئی صدی میں مقام بنانے والی ایک منفرد فکشن نگار ہیں۔آپ کے افسانے ہوں یا ناول اور ناولٹ،سب میں آپ کا انداز مختلف و منفرد ہے۔اب تک اردو میں آپ کے تین افسانوی مجموعے ''ہرے زخم کی پہچان''، ''اداس لمحوں کی خود کلامی'' اور ''وصفِ پیغمبری نہ مانگ'' ایک ناولٹ ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' ایک ناول ''صدائے عندلیب بر شاخِ شب''،ایک ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''حاشیے پر لکھی تحریر'' شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔اس کے علاوہ تراجم،ترتیب و تالیف اور شاعری بھی آپ کا میدان رہا ہے۔

شائستہ فاخری نے اپنے فکشن کے ذریعہ چونکایا ہے۔ان کے فکشن میں عورت کے قصے ہیں۔تانیثیت ہے۔ان کے افسانوں اور ناولوں کی عورت شروع میں مظلوم و مجبور ہوتی ہے۔مرد کی مرضی کو سر آنکھوں پر رکھتی ہے۔یہ تب ہی تک ،جب مرد پیار والفت کا اظہار کرتا ہے۔لیکن جب مرد ظلم و ستم کی حدیں پھلانگتا ہے،تو یہی مظلوم عورت اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر مرد کے روبرو آجاتی ہے۔

مذکورہ ناولٹ ''نادیدہ بہاروں کے درمیاں'' میں تین اہم اور مرکزی کردار ہیں۔علیزہ اور فرحان میاں بیوی ہیں اور اعیان علیزہ کا دیور۔پورا قصہ ان تینوں کے گرد گھومتا ہے۔بلکہ صحیح معنوں میں علیزہ ہی پورے ناولٹ میں مرکزی حیثیت سے ہے۔علیزہ ہی ہے جو فرحان اور اس کے گھر والوں کا پیار دیکھتی ہے۔فرحان کی نظر التفات اور عنایات کی قائل ہوتی ہے۔اعیان نامی نوجوان جو یتیم و بے سہارا تھا،کو دیور کی شکل میں پاکر علیزہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی ہے۔مگر اسے کیا پتہ تھا کے دیور پر اس کی کرم فرمائیوں اور ہمدردی کو فرحان دوسری طرح لے گا۔اور اس کا وہ دیور،جس کا خیال وہ،شوہر سے بھائی کا رشتہ ہونے کے سبب رکھتی ہے،ایک دن اس کے لیے سوہانِ روح ثابت ہوگا۔مانا کہ علیزہ اپنے دیور کو پسند کرتی ہے۔مگر وہ صدفی صد فرحان کی تھی۔دیور اعیان کو پسند کرنے کا سبب اور معیار الگ تھا۔فرحان کو اگر اعیان کا خیال رکھنا پسند نہیں تھا،تو ایک بار کہہ دیتے۔وہ

اس کے سائے سے بھی دور رہتی۔ ناولٹ کے چند اقتباسات دیکھیں:

"رات کا درمیانی حصہ تھا۔ علیزہ ایک دردناک چیخ کے ساتھ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نیند، خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ سردی کے باوجود جسم پسینے سے تر تھا۔ کمرے میں گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ شاید بجلی چلی گئی تھی۔ بینائی اندھیرے کو چیرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، علیزہ نے ایمرجنسی لائٹ جلائی، ٹیوب کی روشنی پھیل گئی۔"

[نادیدہ بہاروں کے نشاں، شائستہ فاخری، ص15]

"علیزہ نے خواب میں یہی تو دیکھا تھا کہ بٹوارے میں بانٹی گئی زمین کی طرح اس کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ وہ نڈھال چت پڑی ہے۔ جسم کے داہنے حصے کا کوئی تعلق بائیں حصے سے نہیں ہے اور نہ بایاں داہنے حصے کو چھو رہا ہے۔ سر، چہرہ، گردن سینہ، پسلیاں، ناک اور پھر ناف کے نیچے کی نازک سطح تک سب کچھ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ دماغ کے دو حصوں میں بٹتے ہی منقسم فکر اور نتائج کے سلسلے بھی ٹوٹ گئے۔ ذہن کچھ سوچنے سے محروم ہو گیا..... تکمیلیت کہیں نہیں۔ تکمیل کی پوری منزل ڈوبتے سورج کے عذاب میں گم ہو چکی تھی۔ اب وہ کاٹھ کی پتلی کی طرح ٹوٹی کئی حصوں میں منقسم پڑی ہوئی ہے۔"

[نادیدہ بہاروں کے نشاں، شائستہ فاخری، ص16]

"فرحان نے دیکھا کہ اعیان دیوان پر چت لیٹا ہوا ہے، اس کی دونوں ٹانگیں برہنہ تھیں۔ علیزہ دیوان سے سٹی بیچوں بیچ کھڑی جھک کر کسی عمل میں مصروف ہے۔

فرحان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ غصے اور نفرت سے وہ باؤلا ہو اٹھا، غضب خدا کا، میری غیر موجودگی میں اتنی بے باکی، وہ بھی کھلے دروازے.......کیا ان لوگوں نے سمجھا ہے ابی کہ جگہ فرحان مر گیا۔ اس کی بینائی کے آگے جیسے پردہ پڑ گیا ہو۔ اسے صرف لیٹا ہوا اعیان اور جھکی ہوئی کسی عمل میں مصروف علیزہ ہی نظر آ رہی تھی۔"

[نادیدہ بہاروں کے نشاں، شائستہ فاخری، ص75]

"شلوار سوٹ میں ملبوس اس کی بیوی اسے برہنہ نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اور زیادہ بے حیائی نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ یکلخت وہ آگے بڑھا اور پیچھے سے اس نے علیزہ کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف گھمایا اور ایک بھرپور زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر مارا۔ بدبخت عورت! میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں...."

[نادیدہ بہاروں کے نشاں، شائستہ فاخری، ص76]

غلط فہمی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اور جب یہ حد پار ہو جاتی ہے تو علیزہ کی قسمت میں غصہ، مار اور طلاق کے بول آتے ہیں۔ طلاق اکثر غصے میں بغیر سوچے سمجھے دیا جاتا ہے۔ اور ایسے طلاق کے بہت خطرناک نتائج ہوتے ہیں۔ سب کچھ خاکستر ہو جاتا ہے۔ غصہ ٹھنڈا ہونے پر جب دماغ ٹھکانے پر آتا ہے تو سب کچھ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ فرحان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ غصے میں غلط فہمی کی بنیاد پر علیزہ کو طلاق دے تو دیتا ہے، مگر پھر افسوس، پچھتاوے اور شرمندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر طلاق کوئی کھیل نہیں، کہ بساط بچھائی کھیل کھیلا اور بساط اٹھا دی، شہ اور مات کا اصل زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ طلاق، وہ جائز عمل ہے جو خدا کو بھی ناپسند ہے۔ طلاق میں ایک عورت کا پورا جہان، اجڑ جاتا ہے۔ اسے عدت کے دور سے گذر کر ایک نئی شروعات کرنی ہوتی ہے۔ علیزہ بھی ایسے دور سے گذرتی ہے۔ اور جب اسے پتہ چلتا ہے کہ فرحان اپنے کئے پر نادم ہے، اور اس کو دوبارہ نکاح میں لانا چاہتا ہے، تو وہ لرز جاتی ہے، کہ اس کی کوئی مرضی نہیں۔ سب کچھ مرد ہی کرتا پھرے۔ غصے اور غلط فہمی کی بنا پر پل بھر میں سارے رشتے ختم کر لے اور جب غصے اور غلط فہمی کا نشہ اترے تو دوبارہ نکاح کی کوشش کرے۔ اس کی تو کوئی مرضی ہی نہیں، اس کی زندگی ایک جانور کی سی ہو گئی کہ ایک کھونٹے سے کھول کر دوسرے سے باندھ دو، وہ کچھ کہتا نہیں۔ طلاق اور پھر دوبارہ نکاح میں لانے کے لیے حلالہ۔ یعنی ہر صورت میں ایک عورت کو قربان گاہ پر چڑھنا۔ طے پایا کہ اعیان کے ساتھ حلالہ کرنا پڑے گا۔

"اس لیے اسے اعیان کے ساتھ حلالہ کرنا ہے۔ یعنی ایک ایسا وقتی نکاح جو شب بسری کے بعد ہی اسے پھر سے طلاق دے دیا جائے گا تاکہ وہ فرحان کے لیے حلالہ بن جائے۔ یہ طلاق اعیان دے گا۔ ایک بار پھر اسے تین مہینے کی عدت گزارنی ہوگی۔ اس کے بعد اپنے سابقہ شوہر فرحان مرزا کے ساتھ ازدواجی زندگی کی تجدید ہو سکے گی۔"

[نادیدہ بہاروں کے نشاں، شائستہ فاخری، ص98]

علیزہ کے لیے فرحان اور اعیان صرف مرد تھے۔ ایک نے

چھوڑا، دوسرے نے نکاح کیا، ہمبستری کی اور پھر چھوڑ دیا۔ دو مردوں کے بیچ وہ سینڈوچ بنی ہوئی تھی، نہ اپنی مرضی نہ اختیار۔ اس کی عزیز سہیلی ڈاکٹر تانیہ سے بھی اس کی بات نہیں، ہو پا رہی تھی کہ فون فرحان کے پاس رہتا تھا۔

عدت گزرنے کے بعد وہ دن بھی آ گیا جب اسے اعیان سے نکاح کرنا پڑا۔ اور وہ قیامت کی رات۔۔۔اف۔۔۔مصنفہ نے اس رات کا بیان بڑی پرتاثیر زبان میں کیا ہے۔

> ''اس رات جب علیزہ نے تڑپ کر اس کے چنگل سے نکلنا چاہا تھا تو اعیان نے اپنی پوری مردانہ طاقت سے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اپنی بھرپور ہتھیلی اس کے منہ پر رکھ دی تھی تا کہ کوئی آواز دروازے سے باہر نہ جانے پائے۔ پھر بھی دروازے کی جھری سے وہ آواز باہر آ ہی گئی تھی جسے سن کر ہی فرحان پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔''

[نادیدہ بہاروں کے نشاں، شائستہ فاخری، ص112]

اس قیامت خیز رات میں، اس کا خواب سچا ہوا۔ وہ سر سے پیر تک دو حصوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ اس کا سب کچھ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ مگر اس رات کے بعد جب اعیان نے ہمبستری کے بعد طلاق دے دیا تو علیزہ عدت گزارنے کے لیے اپنی سہیلی ڈاکٹر تانیہ کے پاس چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر تانیہ کے یہاں رہتے ہوئے وہ ایک بچی کی ماں بھی بنتی ہے۔ عدت کا وقت کسی طرح گزر جاتا ہے۔ ادھر فرحان کا ڈاکٹر تانیہ پر دباؤ بڑھتا ہے۔ لیکن علیزہ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرتی ہے اور وہ خود اکیلے اپنی بچی کو پالنے اور اپنی زندگی گذارنے کا فیصلہ بڑے اعتماد سے لیتی ہے۔

> ''میں مرد کے بغیر زندگی گزار سکتی ہوں کیونکہ اکثر شادی کے معاہدے میں جو جیتتا ہے وہ مرد ہوتا ہے ____ اور وہ اپنی جیت کو عمر بھر کیش کرتا رہتا ہے ___ اور جو ہارتی ہے وہ عورت ہوتی ہے۔ مرد اسے سمجھا دیتا ہے کہ اس کی ہار میں ہی اس کی جیت ہے۔ گھٹنے ٹیکنے میں ہی اس کی بڑائی ہے۔ مرد کے آگے اس کی خود سپردگی اس کی زندگی کی معراج ہے۔ عورت کو اپنی کانچ کی وہ نلی توڑ دینا چاہئے جس میں اس نے خودداری اور انا کے بیج چھپا کر رکھے ہیں۔ جہاں تک جسم کی بات ہے وہ تو فانی ہے، آج نہیں تو کل مٹی کا ہے مٹی میں مل جائے گا۔''

[نادیدہ بہاروں کے نشاں، شائستہ فاخری، ص148]

اس ناولٹ میں مصنفہ نے ایک ایسے واقعے کے بیان پر بھرپور محنت کی ہے جہاں جیسے الفاظ کی ضرورت تھی، وہ استعمال کیے۔ عورت کا مظلوم و مجبور چہرہ بھی دکھایا۔ بے بسی کے حالات کی بھی تصویر کشی کی اور عورت کی خود اعتمادی کو بھی عمدہ طریقے بیان میں لفظوں کا جامہ پہنایا۔ اسلوب کی جہاں تک بات ہے، تو وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ شائستہ فاخری کی زبان اپنے ہمعصروں میں سب سے جدا اور پرتاثیر ہے۔

> ''پچھلے ایک مہینے سے فرحان مرزا کا گھر تین زندہ انسانوں کا قبرستان بنا ہوا تھا۔ جہاں نہ کوئی ماتم کرنے والا بچا تھا اور نہ ماتم پرسی کے لئے کوئی آنے والا۔۔۔ وہ آوازیں جو گھر کی زندگی کا احساس کراتیں، رہنے والوں کو جلا بخشتی تھیں، وہ ناپید ہو چکی تھیں۔ نہ باورچی خانے میں برتنوں کی کھٹر پٹر، نہ تیز تیز چلتے قدموں کی بھاری آہٹ، نہ چوڑیوں کی کھنک، نہ پازیبوں کی جھنک، نہ پکارے جانے والے ناموں کی کوئی بازگشت۔ گھر کے در و دیوار بھی جیسے سہم گئے ہوں۔ کوئی آواز نہیں دیتا تھا۔ کوئی کسی سے کوئی کام نہیں لیتا تھا۔''

[نادیدہ بہاروں کے درمیاں، شائستہ فاخری، ص82]

نادیدہ بہاروں کے درمیاں، میں شائستہ فاخری نے اپنے قلم کے سحر سے ایسا قصہ بیان کیا ہے جو ایک طرف عورت ذات پر مرداساس سماج کے ظلم و ستم کا نوحہ ہے تو دوسری طرف عورت کے اندر آئی بیداری اور اعتماد کا فسانہ ہے تو تیسری طرف مذہب کے قاعدے قانون پر سوالیہ نشان بھی۔ شائستہ فاخری نے بڑے دل پذیر انداز میں پورا ناولٹ لکھا ہے، جسے پڑھ کر قاری کی ہمدردیاں عورت خاص کر علیزہ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ فرحان جیسے کردار ہمارے سماج کا حصہ ہیں، جو بنا سوچے سمجھے، غصے کی حالت میں طلاق تو دے دیتے ہیں، لیکن غصہ اترنے پر پچھتاوے اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی طلاق شدہ بیوی کو پھر سے اپنے نکاح میں لینا چاہتے ہیں۔ ان کی واپسی کی یہ خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ حلالہ جیسے عمل سے گذرنے کو بھی تیار ہوتے ہیں۔ طلاق اور حلالہ میں عورت کی اپنی کوئی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ مصنفہ نے شد و مد کے ساتھ عورت کے حقوق کی آواز بلندی کی ہے۔

Prof. Aslam Jamshedpuri
Urdu Department
Chaudhary Charan Singh University,
Ramgarhi
Meerut-250001(U.P)

سیدہ نسرین نقاش

نظم

کبھی کبھی

کبھی کبھی مجھے ایسا گمان ہوتا ہے
بلائیں ڈھونڈ کے لائی گئیں ہیں میرے لیے
سب ہی کو جیسے میرے خون کی ضرورت ہے
بھٹک رہی ہوں میں تنہا اداس راتوں میں
کسی کو مجھ سے کہاں اب کوئی قرابت ہے
کبھی کبھی مجھے ایسا گماں ہوتا ہے
میں جس کے واسطے کلیوں کو چنتی رہتی تھی
وہ پھر سے آج میرا دل جلانے آیا ہے
فریب کھا کے بھی اپنا سمجھ رہی تھی جسے
وہ شخص آج بھی میرا نہیں پرایا ہے
کبھی کبھی مجھے ایسا گماں ہوتا ہے
کچھ اس طرح سے گزاری ہے زندگی میں نے
کہ زندگی کے تصور سے خوف کھاتی ہوں
کسی سے شکوہ جور و جفا نہیں کرتی
میں لمحہ لمحہ بکھرتی ہوں ٹوٹ جاتی ہوں
کبھی کبھی مجھے ایسا گماں ہوتا ہے
بس اب تو آخری منزل پہ سفر میرا
نہ میرے ساتھ میں تو ہے نہ اب زمانہ ہے
مجھے بلاتا ہے زیرِ زمین گھر میرا
یہی تو نسرین آخری اب ٹھکانہ ہے
کبھی کبھی مجھے ایسا گماں ہوتا ہے

Syeda Nasreen Naqash
Editor 'Sada'
Urdu Monthly
Post Box No 849
G P O
Srinagar-190001 (Jammu & Kashmir)

ڈاکٹر ہاجرہ خاتون

نظمیں

ازلی سچائی

دادی نانی کہتی تھیں
مرد ہمدرد بس بستر بھر
خواب گاہ کے باہر
سنہرے لمحوں کا
عکس بھی مت ڈھونڈنا
ناٹک میں بھیس بدلنے جیسا تجربہ

تو کیا
دادی نانی کا کہنا
ازلی سچائی ہے!!!

جواز

دو بھائیوں کے بعد
میرے جنم سے
خوش تھی ماں
وہ میرا معصوم حسن دیکھتی
اور ملنے والیوں سے کہتی
مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے
بیٹی میری
خدا کرے کہ
بھاگیہ بھی مجھ سے اچھے ہوں

کاش۔۔۔۔
ماں نے دیکھی ہوتی
جلادوں کی دنیا
صلیب پر ٹنگی
میری زندگی
تو میری تخلیق پر
خوش ہونے کا جواز بھول جاتی

Dr. Hajra Khatoon
1C Zuleikha Enclave,
Parastoli, Doranda,
Ranchi-834002
Mobile no 9430254770

غزلیں

سیدہ تبسم منظور ناڈکر

وہ مرے واسطے ہے پیار کی مورت جیسا
عشق اس کے لیے میرا ہے عبادت جیسا

تجھ کو دیکھوں تو مجھے چین سکوں ملتا ہے
آج تک دیکھا نہیں کوئی تری صورت جیسا

میں نے اکثر اسے خوابوں میں نکھرتے دیکھا
کاش بن جائے مرا خواب حقیقت جیسا

کوئی کرسکتا نہیں مجھ کو الگ اس سے کبھی
غنچہء دل میں سمایا ہے وہ نکہت جیسا

بے قراری میں بھلا دل کی بتاؤں کس کو
کرب تیرا ہے شبِ ہجر میں وحشت جیسا

تیری ہر بات تبسم ہے نصیحت مجھ کو
تیرا ہر لفظ کتابوں کی تلاوت جیسا

بنا لوں اپنا تجھے میں سدا سدا کے لیے
ہے ساتھ تیرا ضروری مری بقا کے لیے

نہیں ہے زیست میں میری کوئی مزہ لیکن
میں جی رہی ہوں فقط ایک بے وفا کے لیے

لبوں پہ نام فقط میرے تیرا ہی آیا
اٹھائے ہاتھ کبھی میں نے جب دعا کے لیے

ترے بغیر مری سانس چل نہیں سکتی
جدا نہ ہونا تو مجھ سے کبھی خدا کے لیے

ترے خیال سے آباد یوں کیا اس کو
جگہ نہیں ہے مرے دل میں ما سوا کے لیے

کہاں ہے مجھ کو ضرورت بھلا چراغوں کی
چمکتے اشک ہیں کافی مجھے ضیا کے لیے

مجھے یقین ہے کردے گا وہ معاف مجھے
صمیمِ قلب سے نادم ہوں میں خطا کے لیے

لبوں پہ میرے تبسم ترے خیال سے ہے
ترا خیال ہے ضامن میری شفا کے لیے

Syeda Tabassum Manzoor Nadkar
226/1807,Road No 6
Motilal Nagar No 1,Goregaon west
Mumbai(W)-400104 (M.S)

ڈاکٹر زیبا ناز

چہرہ

آج صبح مجھے جلدی سو کر اٹھنا تھا لیکن یہ کیا؟ سات بج رہے ہیں! گھڑی پر نظر پڑتے ہی میرے پیروں تلے کی زمین کھسک گئی۔ میں نے فوراً موبائل چیک کیا، الارم بھی سیٹ کیا تھا جس نے اپنی ڈیوٹی نبھائی ہوگی آواز سے آنکھ نہیں کھلی۔

رات پتہ نہیں کس وقت آنکھ لگی ہوگی؟ پینڈولم کے دو بجانے تک تو میں سوئی نہیں تھی، نہ جانے کون کون سی فکریں حصار کیے ہوئے تھیں؟ ایک بات ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع ہو جاتی، انجانی اور بے مقصد تصاویر کی کڑی سے کڑی جڑتی چلی گئی! حاصل نہ وصول! مگر اب کیا ہوگا؟ کیا کیا کروں؟ کالج کیسے پہنچوں گی؟ پتہ نہیں بس کس وقت ملے گی؟ گھر کے سارے کاموں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں آناً فاناً تیار ہو کر بیٹے کو اسکول چھوڑتی ہوئی کالج کے لیے روانہ ہوگئی۔ اتفاق سے بس فوراً مل گئی۔ جس سیٹ پر مجھے جگہ ملی، اس پر ایک لڑکی پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے لگا کہ پہلے بھی میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ بلکہ بات بھی ہوئی ہے۔ لیکن کہاں؟ کس متعلق؟ کچھ یاد نہیں آ رہا! دراصل متعلقین بھی تو بہت ہوتے ہیں۔ اسکول، کالج، محلے والے، استاد، شاگرد، دوست احباب ان کے رشتے دار، سیمناروں میں ملنے والے، سفر میں ٹکرانے والے اور بھی نہ جانے کون کون! ذہن کہاں نہیں دوڑایا۔ لیکن کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ یہ کون ہے آخر؟ اس مسئلے کا حل تو اس وقت نکلے گا، جب یہ میری جانب دیکھ کر کوئی ردعمل ظاہر کرے گی۔ لیکن اسے تو فون سے ہی فرصت نہیں۔ ایک گھنٹے کا سفر اس نے فون پر بات کرتے ہوئے گزار دیا۔ کمال ہے اسے اتنی مہلت بھی نہیں ملی! کہ ایک نظر اپنے نزدیک بیٹھی سواری پر بھی ڈال لے۔ وہ اپنی باتوں میں اس درجہ منہمک تھی۔ میں چاہتی تو بہ آسانی سن سکتی تھی کہ وہ کس سے اور کس طرح کی گفتگو کر رہی ہے لیکن مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں! اور ہونی بھی نہیں چاہیے یہ اخلاقی جرم ہے۔

میرا ذہن پیہم گردش کرتا رہا کہ آیا یہ ہے کون؟ کئی مرتبہ میں نے اپنے ذہن کو اس طرف سے ہٹانے کی کوشش کی کہ ہوگی کوئی! چھوڑو بھی اپنا کام کرو۔ لیکن دل نہیں مانتا تھا۔ کیوں کہ وہ اتنی حسین، جاذبِ نظر، پرکشش اور معصوم تھی کہ اسے بار بار دیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ پکا رنگ، ستواں ناک، اونچی پیشانی، لمبے لمبے بال، سڈول کلائیوں میں کم کم چوڑیاں جو بس یونہی پڑی تھیں، مہذب لباس، سر سے دوپٹہ اوڑھے بالکل ہندوستانی تہذیب کا مرقع، جی کرتا تھا دیکھتے ہی رہو۔ لیکن یہ بھی غیر مناسب بات ہے۔ کسی کو خواہ مخواہ کیوں دیکھتے رہو، معیوب محسوس ہوتا ہے۔ ایسی نازیبا حرکتوں سے خود کو بھی شرمندگی ہوتی ہے نہ دیکھوں تو دل کو تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کار جیت دل کی ہوئی۔

جہاں سے مجھے سواری بدلنی تھی حسنِ اتفاق وہ بھی میرے ساتھ اسی میں سوار ہوگئی، اب اس کے ہاتھ اور کان مصروفِ کار نہ تھے موقع کو غنیمت

جان کر میں نے مخاطب ہو کر گفتگو میں پہل کرتے ہوئے کہا...... "لگتا ہے آپ کو کہیں دیکھا ہے"؟

اس نے پرتپاک انداز میں نہایت اپنائیت سے کہا...... "تم حبا ہو نہ"............؟

میرے استعجاب کی انتہا نہ رہی یہ تو میرا نام بھی جانتی ہے۔

جی میں حبا ہوں۔ میں نے قدرے حیرت کو چھپاتے ہوئے سرعت سے جواباً کہا۔

اور............آپ پ پ؟

میں؟ "تم مجھے نہیں پہچانیں"...... "نہیں ایسا نہیں ہے"۔

"میرا مطلب"...... صرف نام میرا مطلب آپ کا نام ذہن سے محو ہو رہا ہے"

میں نے حقیقت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"تمھاری کلاس فیلو انجم"............!

"ہاں ہاں انجم..........کیسی ہے وہ"؟

"بہت دور چلی گئی، غالباً دارجلنگ میں ہوئی ہے شادی اس کی"؟

"جی"

"اچھا..........اچھا اچھا ....اوہ! تبھی تو میرا ذہن اتنی دیر سے غلطاں اور پیچاں تھا۔ الماس ہیں نہ آپ..........."۔

"جی جی"

"ارے بالکل بدل گئیں آپ تو"، "میری گتھی سلجھ گئی......بہت بہت شکریہ"!

دراصل ہم دونوں کی ملاقات تقریباً ایک گھنٹہ قبل ہو جاتی جہاں سے میں اس بس میں سوار ہوئی ہوں لیکن آپ فون پر بزی تھیں۔ آپ کی مصروفیت کہیں اور تھی میری محویت آپ میں تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے دھیرے سے کہا..........."اچھا ایسا کیوں"؟

میں نے اس سے کہہ ہی ڈالا کہ "میں نے آپ کا سا پر مسرت چہرہ اپنی زندگی میں کسی کا نہیں دیکھا کتنی پر سکون اور پُرکشش ہے آپ کی شخصیت، کتنی ہشاش بشاش ہیں آپ"!

میرے الفاظ سنتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جنھیں دیکھ کر میں پریشان ہو گئی اور معذرت طلب کرتے ہوئے کہا کہ اگر مجھ سے کوئی بات غلط ہو گئی ہو تو "سوری" میرا مقصد ہرگز............اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا آپ سوری کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ کی کوئی خطا نہیں یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔

"میں کچھ سمجھی نہیں"..................میں نے تفحص میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

[مجھے حیرت اس وقت ہوئی، جب اس نے کہا کہ میری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں اور میری چار بیٹیاں تھیں۔ اس کی باتیں سن کر میرا سر چکرا گیا۔ وہ تو مجھے کنواری یا نئی شادی شدہ لگ رہی تھی]

الماس نے بتایا کہ اپریل 2020ء میں شوہر کا کورونا میں انتقال ہو گیا۔ بیوہ ہونا تھا کہ سر پر کوہِ بلا ٹوٹ پڑا۔ گھر میں اکیلی کیا کرتی؟ چاروناچار بیٹیوں کو لے کر مائیکے چلی آئی۔ شکر ہے والدین حیات ہیں۔ یہاں آئے پندرہ روز بیتے تھے کہ میری بڑی بیٹی کو بخار آیا ڈاکٹر نے کہا کہ وینٹی لیٹر کے بغیر اس کی جان بچانا مشکل ہے۔ اسپتالوں میں بے انتہا مریض تھے کہیں بھی کسی صورت وینٹی لیٹر کا انتظام نہ ہو سکا اور میری بچی صرف چار دن کے اندر خالق حقیقی سے جا ملی۔ بھولنے کا تو سوال ہی نہیں شوہر کا غم ابھی کم نہ ہوا تھا کہ بیٹی کے غم نے مجھے ہلاک کر دیا۔ کاتب تقدیر نے جو لکھ دیا..................."میں نے صبر کیا"۔

ایک مہینے بعد میری سب سے چھوٹی بیٹی جس کی عمر صرف تین سال تھی اسے بھی بخار آیا، دو اموات نے مجھ پر بری طرح خوف طاری کر دیا تھا۔ میں بدحواس فوراً اسے ڈاکٹر کے لے کر گئی۔ وبا نے ایسے پائوں پسارے تھے کہ ڈاکٹر بھی گھبرائے ہوئے تھے۔

ایک مہینے بعد میری سب سے چھوٹی بیٹی جس کی عمر صرف تین سال تھی اسے بھی بخار آیا، دو اموات نے مجھ پر بری طرح خوف طاری کر دیا تھا۔ میں بدحواس فوراً اسے ڈاکٹر کے لے کر گئی۔ وبا نے ایسے پاؤں پسارے تھے کہ ڈاکٹر بھی گھبرائے ہوئے تھے۔

مریضوں کو ہاتھ لگانا تو درکنار وہ نزدیک بھی نہیں آرہے تھے۔ خیر پردے کے پیچھے سے ہی کیمرے کی مدد سے انھوں نے میری بٹیا کو دیکھا اور حال چال پوچھ کر دوا دے دی۔ میں نے اس کو تو دوا دے کر سلا دیا اور خود کو یونہی جھوٹا دلاسہ دے دیا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ تو سو گئی تھی لیکن خوف نے مجھے آنکھ بھی نہ جھپکنے دی۔ ناامیدی کی گھٹائیں مجھ پر بری طرح سایہ کیے ہوئے تھیں۔ رات کے سناٹے تاریکی اور طوالت نے ان گھٹاؤں کو مزید مہیب بنا دیا تھا۔ صبح نماز سے فارغ ہوتے ہی............

یہ جانتے ہوئے کہ یہ اچھی نیند کا وقت ہوتا ہے ۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن جسے رب اٹھا چکا ہو اسے کون اٹھا سکتا ہے............''میں نے صبر کیا''۔

پے در پے صدمات اس طرح حملہ آور ہوئے کہ میری سدھ بدھ جاتی رہی۔ میں نا جانے کیا سے کیا ہوگئی! اور............اور............تم کہتی ہو کہ میرے چہرے پر جو خوشی ہے وہ تم نے زندگی میں کسی چہرے پر نہیں دیکھی۔ کیسی عجیب بات ہے یہ بھی۔۔۔! ابھی اور باتیں کرنی تھیں اسے مجھ سے، لیکن کالج آ گیا تھا لہٰذا میں اجازت لے کر کالج پر اتر گئی۔ اس کا سفر ابھی باقی ہے۔ وہ پُرسکون چہرہ اپنے سینے میں نہ جانے کتنے طوفان چھپائے استقلال سے اپنی منزل کی جانب گامزن ہے۔

آج میں کالج ضرور آئی تھی لیکن میرا ذہن الماس کی درد بھری کہانی میں گم تھا۔ مجھے جو بھی دیکھتا حال دریافت کرتا۔ میرے ساتھی اور طالبات بار بار معلوم کر رہے تھے کہ آج کیا بات ہے آپ پریشان ہیں؟ میں کسی کو کیا رودادسناتی؟ وہ بھی کس کی! کون تھی وہ میری! وہ بھی ایسی جگہ اور اس ماحول میں جہاں شماتت اپنے عروج پر ہو۔ جہاں کوئی رسماً بھی خیریت پوچھ لے تو ڈر لگتا ہے کہ نہ جانے کیا راز ہے؟

گھر آ کر میں نے امی کو الماس کی کہانی سنائی تو انھوں نے کچھ دیر سوچ کر کہا کہ جو لوگ مشیت ایزدی پر قناعت کرتے ہیں اور خوشی خوشی اس کی امانت اس کے سپرد کر دیتے ہیں اللہ ان کے چہرہ پر ایسی ہی خوشی اور اطمینان پیدا کر دیتا ہے جو نور بن کر ان کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ وہ اللہ کو پسند ہوتے ہیں اسی لیے سب کو پیارے لگتے ہیں۔

□□□

Dr. Zaiba Naaz
Nai Basti
Bada Shah Safa
Muradabad-244001 (U.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............................ بتاریخ............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

صاحبہ فردوس

سائبان

زندگی دھوپ چھاؤں کی مانند ہے۔کبھی زندگی تپتے ہوئے صحرا میں محوسفر رہتی ہے تو کبھی بہاریں ہی بہاریں ہماری منتظر ہوتی ہیں۔وہ تپتی ہوئی دھوپ میں سڑک پر پیدل سفر کررہی تھی۔پچھلے کئی ماہ سے وہ جاب کی تلاش میں تھی۔اُسے جاب تو نہیں ملی تھی ہاں البتہ اُس کی چپل میں چھید ضرور پڑ گئے تھے جس کے باعث شعلے برساتی ہوئی دھوپ اُس کے تلوؤں کو بھی جھلسا رہی تھی۔چہرہ الگ دھوپ کی تمازت سے سُرخ ہورہا تھا تبھی اچانک اُس کے منہ سے کراہ نکلی تھی وہ سڑک کے کنارے آ کھڑی ہوگئی اور پیر سے چپل نکال کر اُس کا معائنہ کرنے لگی۔جس میں بری طرح سے کانٹا چبھ گیا تھا چشم فلک سے دو آنسو لڑھک کر اس کے رُخسار کا حصہ بن گئے تھے یہ آنسو کانٹا چبھنے کے دُکھ پر نہیں بہہ رہے تھے بلکہ اپنی بے بسی پر بہہ رہے تھے۔اس نے چپل کے آر پار ہوتا ہوا کانٹا نکالا اور واپس وہی چھید والی چپل پہن کر اپنی راہ لی۔

گھر پہنچی تو اماں صحن میں بچھی چار پائی پر بیٹھیں دلچسپی سے ننھی نیہا اور طلال کو کھیلتے دیکھ رہی تھیں۔اُسے دیکھ کر نیہا اور طلال امی۔۔۔امی کہتے دوڑتے ہوئے اُس کے پاس آگئے اور اُس کے پیروں سے لپٹ گئے۔بچوں کی امی کی گردان سُن کر وہ پنجوں کے بل وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور اُنھیں اپنی باہوں میں بھر لیا۔اُس کی ماماتا بھری آغوش میں دونوں بہن بھائی نے ٹھنڈک سی محسوس کی پھر اُنھیں خود سے الگ کر کے ماں کے پاس چار پائی پر آبیٹھی۔اُسے پسینے میں شرابور دیکھ کر اماں اُس کے لیے پانی لانے کے لیے اُٹھنے لگیں تو اُس نے ان کا ارادہ بھانپ کر انھیں روک دیا۔

”رہنے دیں اماں! میں خود پی لوں گی۔“اتنا کہہ کر وہ صحن میں موجود چھوٹے سے کچن میں آگئی پھر مٹکی سے ٹھنڈا پانی نکال کر وہیں بیٹھ کر پیا اور واپس اماں کے پاس آبیٹھی۔اُس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر اماں کی ہمت نہیں ہوئی کوئی سوال کرنے کی مگر پھر اماں نے خود میں ہمت باندھی اور حسب معمول ایک ہی سوال دہرانے لگیں۔

”کیا بنا نوکری کا؟“اماں کے سوال پر ہمیشہ کی طرح ایک تلخ مسکراہٹ اُس کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

”اماں! آپ کو کیا لگتا ہے یہاں مجھے جاب اتنی آسانی سے مل جائے گی؟جنھیں جاب ملتی ہے اُن کی یا تو سفارش ہوتی ہے یا پھر اچھی ڈگریاں مگر افسوس کہ میرے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“اُسے یوں مایوس

دیکھ کراماں نے ہمیشہ کی طرح ڈھارس باندھتے ہوئے کہا۔

"مایوس نہ ہو میری بچی! مایوسی کفر ہے اوراللہ نے جب تمھیں تمھاری اولاد کی کفالت کا ذمے دار بنایا ہے تو زرق بھی عطا کرے گا ایسے مایوس نہیں ہوتے۔" اپنے بچوں کے چہروں کو دیکھ کر مزید تلخی اُس کے اندر سراُبھارنے لگی۔ اگر یہ بچے نہ ہوتے تو اُسے اتنی صعوبتیں بھی نہ اُٹھانی پڑتی اور شاید مرنا بھی آسان ہوجاتا مگر ہم ناہی اُس رب کے کیے فیصلوں کو بدلنے پر قادر ہے نہ ہی ہماری اتنی اوقات ہے۔

☆............☆............☆

ماہ نور ساجدہ بیگم کی ایک ہی اولاد تھی۔ جب ماہ نور بیس برس کی تھی تب ساجدہ بیگم کے سر پر بیوگی کی چادر تن گئی تھی۔ ساجدہ بیگم کو اپنے بیوہ ہونے کے غم سے زیادہ جوان جہان بیٹی کے سر سے اپنے باپ کا دست شفقت اُٹھ جانے کا غم تھا۔ ماہ نور شکل وصورت قد وکاٹھ میں بالکل اپنے والد پر گئی تھی سُرخ وسفید رنگت والی ماہ نور کو جب کوئی دیکھتا تو ٹھٹک سا جاتا تھا۔ ساجدہ بیگم کو اُس کی خوبصورتی سے خوف آتا تھا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا جو اُنھیں کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا تھا۔

ماہ نور خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ کافی ذہین وفطین تھی وہ بی اے کے آخری سال میں تھی تب ساجدہ بیگم نے اُس کی پڑھائی بیچ میں ہی رُکوا کر اُس کی شادی اپنے بہن کے بیٹے اعجاز سے کروادی۔ اعجاز زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا اُس نے میٹرک کے بعد اپنے باپ کی کرانا دکان سنبھال لی تھی۔ ساجدہ بیگم کو اُس وقت اعجاز اپنی بیٹی کے لیے سب سے زیادہ قابل لگا تھا اس لیے اُنھوں نے اعجاز سے ماہ نور کو بیاہ دیا۔

ماہ نور نے فرمابردار اولاد ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے خندہ پیشانی سے اعجاز کو قبول کرلیا تھا۔

ثمینہ خالہ روایتی ساس ثابت ہوئی تھیں بیٹے کے سامنے اُن کا لہجہ شیریں ہوجاتا بیٹے کی پیٹھ پیچھے اُن کی زبان نشتر چلایا کرتی تھی۔ خالہ کی دوسری اولاد زبیر اور جبیں بھی اُن کا بھرپور ساتھ دیتے تھے مگر وہ اپنی زبان پر قُفل لگائے صبر وشکر سے کام لیا کرتی تھی کیونکہ اُسے اعجاز جیسا محبت کرنے والا ہمسفر ملا تھا اُسے اس کی محبت اور توجہ کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے تھا۔ شادی کے ایک سال بعد اللہ نے اُسے جڑواں بچوں سے نوازا تھا۔ جن کا نام اعجاز اور ماہ نور نے اپنی باہمی رضامندی سے طلال اور نیہا رکھا تھا۔ طلال اور نیہا کے آنے کے بعد تو اُسے اپنی دنیا مکمل محسوس ہوتی تھی ایسا لگتا تھا جیسے اب کوئی غم کا بادل اس کی دہلیز پر دستک نہیں دے گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا ابھی طلال اور نیہا دو سال کے ہی ہوئے تھے کہ اچانک پیٹ میں اپینڈکس پھوٹنے کے باعث اعجاز کی موت ہوگئی اور وہ ایک بار پھر بے سائبان ہوگئی۔

خالہ کو تو پہلے ہی اپنے پوتے پوتیوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اوپر سے گھر کا کماؤ پوت بیٹا بھی داغ مفارقت دے گیا تھا۔ بچوں کا اور اُس کا خرچہ کون پورا کرتا۔ اس لیے انھوں نے اُسے بچوں سمیت گھر سے نکال دیا اور وہ ایک بار پھر اپنے والدین کی دہلیز پر آبیٹھی۔ ماں خود پائی پائی کی محتاج تھیں وہ کیسے اُس سمیت اُس کے بچوں کی ذمے داری اُٹھاتیں۔ وہ بھی ماں کے حالات سے بخوبی واقف تھی پھر وہ کمر بستہ ہوگئی اور نوکری کی تلاش میں لگ گئی مگر کم تعلیم کے باعث اُسے جاب مل کر ہی نہیں دے رہی تھی۔

کافی تگ ودو کے بعد اُسے محلے کے اسکول میں جاب مل گئی تھی پانچ ہزار ماہواری تنخواہ کے ساتھ۔ اس کی نوکری سے زیادہ نہیں تو تھوڑے ہی اُن کے گھر کے حالات سُدھرے تھے۔ وہ اپنے حالات سے سمجھوتا کرکے اپنی اولاد اور اپنی ماں کی خاطر جی رہی تھی۔ زندگی میں بہاریں تو اب بھی نہیں تھیں مگر اب وہ تپتے صحرا میں بھی سفر نہیں کر رہی تھی۔

اسکول کے تمام اسٹاف کے ساتھ اُس کی صرف علیک سلیک ہوتی تھی کسی سے گہرا تعلق نہیں تھا اور ناہی اس کے لیے دیے انداز پر کوئی اس سے زیادہ میل ملاپ رکھتا تھا۔

اسکول میں جاب کرتے ہوئے اُسے چھ مہینے ہوگئے تھے ایک دن وہ اسکول سے گھر آئی تو اماں اُسے مسرور سی نظر آئیں۔ اماں کو خوش دیکھ کر وہ اُن کی خوشی کا سبب جانے بغیر نہیں رہ سکی تھی وہ اماں کے پاس چار پائی پر آبیٹھی اور پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے اماں آج آپ بڑی خوش نظر آرہی ہیں؟" اُس کے سوال پر ساجدہ بیگم خوشی سے گویا ہوئیں۔

"ہاں میں بہت خوش ہوں کیونکہ آج تمھارا رشتہ آیا ہے۔" اماں کی بات سُن کر اُس کے اعصاب تن گئے تھے وہ خود کو نارمل کرتے ہوئے بولی۔

"اچھا کون ہیں وہ اماں؟" اماں سادگی سے پھر گویا ہوئیں۔

"تم جانتی ہو اُنھیں تمھارے اسکول کے پرنسپل ہیں سر جواد۔" اماں کی بات سُن کر وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی اُسے سر جواد سے ایسی امید نہیں تھی۔ وہ تو انھیں شریف النفس سمجھتی تھی مگر وہ بھی عام مردوں کی طرح نکلے اُسے کسی گہری سوچ میں غرق دیکھ کر اماں بولیں۔

"کیا بات ہے ماہ نور؟ تم خوش نہیں لگ رہی ہو؟" اُن کی بات پر وہ تلخی سے گویا ہوئی۔

"اماں میں کیسے خوش ہوسکتی ہوں؟ جبکہ آپ جانتی ہیں کہ میں اپنے بچوں کو چھوڑ کر نئی زندگی نہیں بساؤں گی۔" اُس کی بات بھی ٹھیک تھی مگر اماں اُسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"بچوں کی خاطر ہی تو میں تمھیں دوسری شادی کرنے کا کہہ رہی ہوں۔ تمھیں اور تمھارے بچوں کو سائبان کی ضرورت ہے میرا کیا ہے میں آج ہوں کل نہیں۔ پھر تم اپنے بچوں کو کس کے بھروسے رکھوگی؟ میرے بعد تمھارا اور تمھارے بچوں کا کون سہارا ہوگا؟ تم چاہے کتنی بھی بہادر بن جاؤ تمھیں اس سے بھی بہتر نوکری مل جائے مگر تمھارے سر پر جب تک مرد کا سایہ نہیں ہوگا یہ دنیا تمھیں جینے نہیں دے گی۔ عورت، مرد کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے پھر چاہے مرد اُس کا باپ، بھائی، شوہر ہی کیوں نہ ہو۔" اماں کی باتیں اُس کی سمجھ میں آ رہی تھیں مگر ایک سوال اُس کے اندر کھلبلی مچا رہا تھا۔

"اماں! کیا اُنھیں پتا ہے میں بیوہ ہوں اور دو بچوں کی ماں بھی ہوں؟"

"ہاں میں نے اُنھیں تمھارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے پھر بھی وہ تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

سر جواد چھتیس برس کے تھے بیوی سے علیحدگی کے بعد اپنے نو سالہ بیٹے کے ساتھ تنہا رہتے تھے۔

دوسرے دن وہ اسکول آئی تو اُس کی نظریں اپنے آفس میں بیٹھے سر جواد پر پڑی جو شیشے کی کھڑکی سے صاف نظر آ رہے تھے۔ خوش شکل اور باوقار سے سر جواد اس قابل نہیں تھے کہ اُنھیں بغیر کسی ٹھوس وجہ کے ٹھکرایا جا سکے پھر اُس نے فوراً ہی ایک فیصلہ لیا تھا۔

کچھ دن بعد اُس نے بڑے ہی احسن طریقے سے بغیر کوئی جواز پیش کیے انکار کر دیا تھا۔ اُس کے انکار پر اماں کے ساتھ ساتھ سر جواد بھی حیران تھے۔ اُنھوں نے انکار کی وجہ جاننے کی کوشش کی مگر ماہ نور نے وجہ تو نہیں بتائی ہاں بس خاموشی سے جاب چھوڑ کر آ گئی۔ اماں پریشان تھیں کہ ایسا کیا ہوا جو اُس نے بڑی مشکلوں سے ملنے والی جاب کو یوں چھوڑ دیا تھا اور گھر بیٹھے بٹھائے ملنے والا اتنا اچھا رشتہ بھی ٹھکرا دیا مگر وہ اماں کو کیا بتاتی کہ اس نے صرف اپنے بچوں کے مستقبل کو داؤ پر لگنے سے بچایا ہے۔

وہ اُس دن سر جواد سے مل کر انھیں اپنا ہاں میں جواب سنانا چاہتی تھی۔ وہ ابھی اردو کا پیریڈ لے کر کلاس سے نکلی ہی تھی کہ تیسری جماعت سے اُسے سر جواد کی کرخت آواز سنائی دی تھی وہ کسی بچے کو بری طرح اس کی کسی غلطی پر مار رہے تھے ساتھ ہی مغلظات بھی بکتے جا رہے تھے۔ انھیں معصوم سے بچے کی آہ و زاریاں بالکل سنائی نہیں دے رہی تھیں بس وہ وحشی بنے اپنی وحشت اس بچے پر نکال رہے تھے۔ وہ پر وقار سے سر جواد کے رویے کو حیران کن نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سر جواد کا اصلی چہرہ ہے جو وہ دوسروں کے سامنے خود کو سلجھے ہوئے اور سمجھدار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ سر جواد کے رویے پر الجھی ہوئی سی اسٹاف روم میں چلی آئی تھی تبھی میڈم رومی، میڈم حسینہ کی آپسی باتیں اس کے کان سے ٹکرائی تھیں۔

"تم نے دیکھا سر جواد تیسری جماعت کے تنویر کو کس قدر بے رحمی سے مار رہے تھے۔" میڈم حسینہ بھی افسوس سے کہنے لگی تھیں۔

"ہاں میں نے دیکھا تھا مجھے تو اس بچے پر بری طرح رحم آیا۔ سنا ہے سر جواد کی اپنی بیوی سے علیحدگی بھی ان کے اس سخت مزاج کی وجہ سے ہوئی ہے وہ اپنی بیوی اور اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ بھی اسی طرح سے سخت تھے۔" میڈم رومی اور میڈم حسینہ کی باتوں نے اُس کی الجھن کو بالکل صاف کر دیا تھا۔

اُس نے تو چڑیا کی طرح اپنے نازک پروں میں اپنے بچوں کو چھپا کر رکھا تھا پھر وہ کیسے اُنھیں ایک نئی آزمائش میں ڈال دیتی۔

سر جواد کا رویہ اپنے سگے بیٹے کے ساتھ ایسا تھا تو ان سے شادی کے بعد اُس کے بچوں کے ساتھ وہ نہ جانے کیا کرتے جبکہ اس کے بچے تو ان کے سوتیلے بچے ہی ہوتے ناں۔ کچھ رشتے کبھی کبھی بوجھ بن جاتے ہیں اور وہ اپنے ننھے سے بچوں کے کندھوں پر ان چاہے رشتوں کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ پھر اُس نے بروقت فیصلہ کیا تھا اور خود کو مجبوریوں کی بیڑیوں سے آزاد کر دیا۔ ویسے بھی وہ اپنی اولاد کا سائبان خود بن سکتی تھی عورت اتنی بھی مجبور و بےبس نہیں ہوتی ہے جتنا وہ خود کو سمجھ لیتی ہے اور جب اللہ نے اُس کی اولاد کی کفالت کا ذمے دار اُسے بنایا تھا تو وہ کیوں خود کا اور اپنی اولاد کا بار دوسروں پر ڈالتی۔

☐☐☐

Ms. Saheba Firdous
D/o, Mohammad Ismail
Vill .Anjan Gaon
Surji Shaniwara Peth,
Near Alam Chowk
Distt. Amravati-444705 (M.S)

روبینہ ساگر روبی

یک طرفہ محبت

جنوری 2021 کا آغاز ہو چکا تھا۔ نئی صبح کا مسکراتا ہوا سورج سب کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ سرد ترین موسم کی ٹھٹھرا دینے والی ہوائیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ پھولوں کی مہک لیے صبح گنگنا رہی تھی پیڑوں پر ناچتی گاتی کوئل مدہوش سی پھدک رہی تھی۔ وہ نمازِ فجر ادا کر کے بس ابھی کچھ دیر پہلے ہی ٹیرس پر واک کرنے آئی تھی روز صبح نمازِ فجر کے بعد واک کرنا اس کا معمول تھا۔ آج وہ بے تحاشا خوش تھی کیونکہ اس کا دیرینہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ کئی دنوں سے تیاری کے مراحل میں تھا اور بس کچھ دنوں میں اس کے ہاتھوں میں آنے والا تھا، اس کی کتاب بہت جلد اشاعت کے مرحلے سے گزرنے تھی۔ ردا شیخ ایک بہترین مصنف اور شاعرہ تھی۔ اس کے چاہنے والے اس کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتے تھے اور اُسے اپنے پرستاروں کے تعریفی خطوط بھی موصول ہوتے تھے۔ وہ ایک خوش مزاج لڑکی تھی ہر کوئی اسے پسند کرتا تھا اُسے کہانیاں ٹائپ اور پرنٹ کروانے کے سلسلے میں اکثر کمپیوٹر والے سر فضیل کے آفس جانا پڑتا تھا وہی اس کی کتاب کا کام کر رہے تھے۔

صبح کے گیارہ بج رہے تھے، جب وہ کوئی اسٹوری لکھ رہی تھی اس کے پاس رکھا موبائل کب سے بج رہا تھا اُس نے اپنے ہاتھ میں دبا قلم روک کر موبائل کان سے لگایا تھا۔ سر فضیل کی کال تھی۔ ”جی سر بولیے ردا نے انھیں سلام کرنے کے بعد کہا تھا۔

ردا میڈم آپ کی کتاب کا کام انشاءاللہ بہت جلد ہو جائے گا۔ بس کچھ دن اور انتظار کیجیے آپ کی کتاب تیار ہو کے آجائے گی“ وہ بول رہے تھے اور وہ بہت خوش ہو رہی تھی، ”تھینک یو سو مچ سر میں بہت زیادہ خوش ہوں آپ بہت محنت کر رہے ہیں میری کتاب کے لیے اللہ آپ کے کام میں اور ترقی دے آمین“ ”کوئی بات نہیں میڈم“ سر فضیل نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور کال ڈسکنیکٹ کر دی تھی۔

غروب ہوتے آفتاب کی کرنیں مدھم ہو رہی تھیں۔ موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا، خوشگوار دلفریب ہوائیں چل رہی تھیں شور مچاتے پرندے اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے پہاڑوں پر اڑتے ہوئے سفید بگلوں کے جھنڈ بہت حسین لگ رہے تھے۔

کعب رحمٰن اپنے آفس میں بیٹھا کام میں مصروف تھا یہ اُس کے باس کا آفس تھا جہاں وہ ایک ورکر کے طور پر کام کرتا تھا اُس نے ڈیزائن ٹیکنالوجی کی ڈگری لی ہوئی تھی، وہ ایک پڑھا لکھا محنتی ایماندار اور ذہین لڑکا تھا اور خاصا اسمارٹ بھی تھا۔ سر فضیل رائٹر ردا شیخ کی کتاب کا کام اس

کے آفس میں ہی کروا رہے تھے۔ میرون کلر کی خوبصورت سی کتاب کے پیج کور بن کے تیار ہو گئے تھے۔ آفس میں پیج کور کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کعب ابھی بھی اپنے کام میں بزی تھا جب سر فضیل ردا کی کتاب کے کام کے سلسلے میں اُس کے آفس آئے تھے۔ اور ردا کی کتاب کے پیج کور کو ہاتھ میں لے کر دیکھ رہے تھے کعب نے انھیں دیکھتے ہی سلام کیا تھا اور ان کے ہاتھ میں موجود خوبصورت سے کور پیج کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''سر یہ ردا شیخ کون ہے'' اُس نے جانے کیوں اُن سے پوچھا تھا، ''یہ ہمارے شہر کی رائٹر ہے'' اُنھوں نے فخر سے کہا تھا۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، بہت بڑی بات ہے مجھے ملنا پڑے گا ان سے وہ متاثر کن انداز میں بولا تھا۔

دن گزرتے گئے اور پھر ایک دن ردا کی کتاب تیار بھی ہو گئی تھی اُس کی کتاب چھپ گئی تھی وہ کتاب کو ہاتھوں میں لیے بے تحاشا خوش تھی اُس کے آس پاس کتابوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا وہ اپنی ایک ایک کتاب کو ہاتھ لگا کے دیکھ رہی تھی اور بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی، اس کی فیملی کے لوگ بہت خوش تھے اور اُس کی کتاب شائع ہونے پر اسے مبارکباد دے رہے تھے اس نے اپنی کتاب کو اپنے چاہنے والوں تک پہنچایا۔ اسی طرح کئی مہینے گزرتے گئے اس کا لکھنے کا کام ہنوز جاری تھا۔ اکثر کتابوں میں اس کی تحریریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔

دن گزرتے گئے اور پھر ایک دن ردا کی کتاب تیار بھی ہو گئی تھی اُس کی کتاب چھپ گئی تھی وہ کتاب کو ہاتھوں میں لیے بے تحاشا خوش تھی اُس کے آس پاس کتابوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا وہ اپنی ایک ایک کتاب کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہی تھی اور بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی، اس کی فیملی کے لوگ بہت خوش تھے اور اُس کی کتاب شائع ہونے پر اسے مبارکباد دے رہے تھے اس نے اپنی کتاب کو اپنے چاہنے والوں تک پہنچایا۔ اسی طرح کئی مہینے گزرتے گئے اس کا لکھنے کا کام ہنوز جاری تھا۔ اکثر کتابوں میں اس کی تحریریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔

موسم بدلا تھا اور موسمِ برسات کی آمد ہو چکی تھی۔ کئی دن سے مسلسل ہوتی بارش کا زور اب ٹوٹ چکا تھا کبھی بارش بہت زوروں کی ہوتی تو کبھی رم جھم برس کر چلی جاتی تھی کبھی بادل بہت زور سے گرجتے برستے تو کبھی ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی آج بھی بارش ہوئی تھی گیلی مٹی کی خوشبو ابھی بھی فضا میں بسی ہوئی تھی، آسمان بالکل صاف اور کھلا ہوا تھا صبح کے بارہ بج رہے تھے جب ردا سر فضیل کے آفس جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی اور کعب رحمن بھی اپنے کسی کام سے سر فضیل کے آفس آیا ہوا تھا۔ تبھی نقاب میں ملبوس ردا بھی وہاں آئی تھی ''السلام علیکم سر کیسے ہو'' ردا نے فضیل سر کو سلام کیا تھا ''الحمدللہ آپ کیسے ہو'' ''ہم بھی اچھے ہیں سر اور سناؤ میری کتاب کا کام کہاں تک پہنچا ہے'' ''بس شروع ہے ابھی تو'' آپ نے میری پہلی کتاب بہت اچھی بنائی تھے میری دوسری کتاب کا کام بھی جلدی کیجیے وہ ان سے باتیں کرنے میں مگن تھی یہ جانے بغیر کے سر فضیل کی ساتھ والی چیئر پر بیٹھا کعب اس کی آواز کو سن رہا ہے پھر وہ سر فضیل سے باتیں کرتی ہوئی سامنے بنی کپڑوں کی شاپ پر چلی گئی تھی اور کعب کی نظروں نے اس کا دور تک پیچھا کیا تھا وہ ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اسے دوبارہ دیکھنا چاہتا تھا پتا نہیں کیوں ردا کی دلکش آواز اس کے دل کے اندر تک اتر گئی تھی۔ ''یہ لڑکی کون تھی سر'' وہ اُن سے تجسس سے پوچھ رہا تھا آج کل اس کے گھر والے اس کی شادی کے لیے لڑکی کی تلاش میں تھے، شاید اسی لیے وہ اُن سے ردا کے بارے میں پوچھ بیٹھا تھا۔ ''یہ ردا شیخ ہے ہمارے شہر کی رائٹر۔ ردا ارسلان بھائی کی بھانجی ہے ان کی کتاب کے پیج کور کا کام جو میں نے آپ کے آفس میں کروایا تھا یہ وہی لڑکی ہیں'' اور ردا کے ارسلان ماموں کو کعب جانتا تھا۔ ''آپ میری ان سے بات کروا دو میں ان سے دوستی کرنا چاہتا ہوں'' جانے کس جذبے کے تحت وہ یہ سب سر فضیل سے کہہ گیا تھا وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ ''یار وہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے اور تم سے کبھی بات نہیں کرے گی'' اس نے ایک دو بار ان سے یہی بات کی تھی لیکن انھوں نے اس کی بات کو سنی ان سنی کر دی تھی شاید وہ جانتے تھے کہ ردا اس سے کبھی بات نہیں کرے گی اس لیے انھوں نے کعب کو اس کا کانٹیکٹ نمبر بھی دینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ بس وہ ایک خواب سا لمحہ تھا رختِ زندگانی کا جس نے کعب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا بس وہ ایک لمحے کے لیے اسے اپنی جھلک اپنی آواز سنا کر چلی گئی تھی اور اس کی آواز کو اس نے اپنے دل میں کسی خوشبو کی طرح قید کر لیا تھا وہ خود کو اس خواب لمحوں کی کیفیت سے نکال نہیں پا رہا تھا دل نے ایک دم اس دلکش آواز والی لڑکی سے بات کرنے کی خواہش کی تھی۔ وہ عجیب سی کیفیت لیے گھر واپس آ گیا تھا بے چینی و بے

قراری نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا، دل اس سے بات کرنے اور آنکھیں اسے دیکھنے کی خواہش کر رہی تھیں اور ردا اس کی چاہتوں سے انجان تھی بے خبر تھی وہ جب سر فضیل کے آفس میں آئی تھی تو اس کا دھیان کعب پر نہیں تھا وہ اپنے دھیان میں مگن تھی اُس نے ایک بار بھی کعب پر اپنی نظر نہیں ڈالی تھی۔ اسے پتہ بھی نہیں تھا کہ کوئی اس سے ملنے اس سے بات کرنے کی جستجو میں لگا ہوا ہے۔

مہینے اپنا سفر طے کرتے ہوئے گزر رہے تھے، لیکن کعب کو اب بھی اس کی تلاش تھی۔ ردا کے ارسلان ماموں سے اس کی کئی بار ملاقات ہوئی تھی وہ اپنے کام کے سلسلے میں بہت بار اس کے پاس آتے رہتے تھے اور کعب کا بہت دل چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح ان سے ردا کی خیریت ہی پوچھ لیتا لیکن خود میں اتنی ہمت ہی نہیں پاتا تھا اور ہر بار ہار جاتا تھا وہ تو یہی اسی شہر میں رہتی تھی وہ بس اپنا ہر کام تقدیر پر چھوڑے ہوئے تھا اور سوچتا تھا اگر ردا اس کی تقدیر میں ہوگی تو خود ہی مل جائے گی یہاں تک کہ اس نے ردا شیخ نام کی کئی لڑکیوں کو فیس کتاب اور انسٹا گرام پر ریکویسٹ تک بھیج دی تھی، مگر افسوس وہ وہاں بھی اُسے نہیں ملی تھی اس کی تلاش بیکار گئی تھی یہاں بھی وہ ناکام رہا تھا کئی بار اس کا دل چاہتا تھا سر فضیل سے اس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہی لے لے، لیکن کیسے مانگتا وہ سوچتا سر فضیل میرے بارے میں کیا سوچیں گے وہ کعب کی بہت عزت کرتے تھے دھیرے دھیرے ردا اُس کی یک طرفہ محبت بنتی چلی گئی تھی۔ وہ اس سے بہت محبت کرنے لگا تھا، اور لاشعوری طور پر اسے بھولنے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن وہ اس کے شعور میں رچ بس گئی تھی وہ اسے بے ارادہ ہی یاد آتی تھی نہ جانے کیوں، جو قسمت میں نہیں ہوتا ہے نا اس سے محبت بھی بے شمار ہوتی ہے یک طرفہ محبت بہت تکلیف دیتی ہے کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت ہے اور اس پر یہ احساس کے ہم جس سے بے انتہا محبت کرتے ہیں وہ ہماری محبت سے آج تک انجان ہے کاش اُنھیں کسی طرح پتہ چل جائے کہ کوئی ہے جو ان کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے کاش، یک طرفہ محبت اکثر لاحاصل ہوتی ہے کیونکہ اس میں ملنے کے چانسز بہت کم ہوتے ہیں اور یک طرفہ محبت کو نبھاتے نبھاتے انسان تھک جاتا ہے ہار جاتا ہے اور محبت بانٹتے بانٹتے ان کی خود کی جھولی محبت سے خالی ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی انہیں اپنے محبوب کی محبّت نصیب نہیں ہوتی ہیں اور وہ ہمیشہ خالی دامن ہی رہتے ہیں۔

شب و روز یوں ہی گزر رہے تھے ردا کا ملنا اس کے نصیب میں نہیں تھا اور وہ اُسے پھر کبھی کہیں بھی نظر نہیں آئی تھی ہزاروں چہروں میں ہزاروں آوازوں میں نہ جانے کیوں کعب کو بس ایک چہرے ایک آواز کی تلاش ہی کیوں تھی کاش ردا اس کی یک طرفہ چاہت سے انجان نہ رہتی کاش اُسے کسی طرح اُس کی چاہتوں کی خبر ہو جاتی کاش وہ بھی اس کا درد جانتی اس کے ساتھ راہِ محبت میں سفر کرتی کاش وہ ایک بار اُسے کہیں مل ہی جاتی وہ اسے ایک بار دیکھ تو لیتا یہ کیسی محبت تھی جو وہ اُس سے بنا دیکھے ہی کرتا تھا۔ وہ اس کی پہلی نظر کا پیار تھی وہ بھی صرف لمحوں کا صرف چند لمحوں کے لیے ہی تو اس نے اس کی آواز کو سنا تھا اور اس کی آواز کے جادو کے سحر سے خود کو اب تک نہیں نکال پا رہا تھا۔ اس نے ایک ایسی لڑکی کو چاہا تھا جس کو بھولنا اس کے اپنے اختیار میں نہیں تھا اور پانا اس کی قسمت میں نہیں تھا۔

سرد رات کی خاموشی پر سناٹا طاری تھا رات آہستہ آہستہ بھیگ رہی تھی اور جن آنکھوں میں رتجگے ٹھہر جائے پھر قیامت ڈھاتی طویل راتیں کسی طرح کٹتی ہی نہیں ہے۔ وہ اب بھی مسلسل اسے یاد آتی تھی اور آ کے اُس کی سانسوں سے لپٹ جاتی تھی، شب و روز اس کی ملن کی آس سے آراستہ تھے لیکن اس کا وصل کعب کے مقدر میں نہیں تھا اسی طرح مسلسل چھ ماہ گزر گئے تھے اور ان گزرے ماہ میں ردا کی کوئی خبر کوئی پتا اُسے اب تک نہیں مل سکا تھا، پتا نہیں کیا تھا جو وہ اسے اب تک ڈھونڈ نہیں پایا تھا شاید اس کے جذبوں میں وہ تڑپ وہ شدت نہیں تھی جو اسے ڈھونڈ نکالتی یا پھر اس کی تلاش میں ہی جستجو نہیں تھی۔ کعب کی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی تھی اب اس کا اپنا خود کا آفس تھا جسے اس نے کعب گرافک کے نام سے کھولا تھا اور ان گزرے مہینوں میں اس کی منگنی ہو چکی تھی، جس کی تلاش جس کی خواہش تھی وہ اسے نہیں ملی تھی اور اس نے رب کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا لیکن دل کے کونے میں کہیں اب بھی ردا کی یاد بسی ہوئی تھی۔

مارچ کے اوائل دن تھے گرمیاں شروع ہو گئی تھیں پرندے درختوں کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ رہے تھے دُھوپ کی شدت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ کعب کا موبائل بج رہا تھا اس کے دوست کی کال تھی اور وہ کعب سے کہہ رہا تھا کے ردا شیخ کی کہانیوں کا کچھ کام ہے جو آپ نے کر کے دینا ہے اُس کا دوست ردا شیخ کو پہچانتا تھا اور کعب ردا کا نام سنتے ہی چونک اٹھا تھا وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی ہے میرے دل کی ادھوری خواہش ردا دل میں اٹھتی درد کی ٹیسوں کو دبائے ہوئے بڑے حوصلے سے اُس نے ردا کے کام کر کے دینے کی حامی بھر لی تھی۔ آخر ردا کا کانٹیکٹ نمبر کسی طرح اس کے پاس آ ہی گیا تھا لیکن کب جب وہ کسی اور کا نصیب بن چکا تھا قدرت کبھی کبھی یوں بھی مہربان ہوتی ہے ہے، وہ سوچ رہا تھا کہ کاش خدا اس کی التجا بہت پہلے ہی سن لیتا تو جس لڑکی سے اس کی منگنی ہوئی ہے اُس سے نہ ہوتی اس کی بجائے ردا اس کی ہم سفر بنتی، جس لڑکی سے اس کی شادی ہونے جا

رہی تھی وہ بھی بہت اچھی تھی لیکن دل مجبور کو کون سمجھائے اُسے تو بس ایک بار جو پسند آ جائے اس کے حصول کے لیے ہی تڑپتا رہتا ہے پھر چاہے وہ حاصل ہو یا نہ ہو دل مانتا ہی نہیں ہے اسے تو بس اپنے دل میں ایک ہی شخص کو قید رکھنا پسند ہوتا ہے وہ کسی کی شراکت بھی برداشت نہیں کر سکتا وہ چاہتا ہے جسے میں چاہوں بس وہ بھی مجھے ہی چاہے۔

دوپہر کا ایک بج رہا تھا، ردا اپنے سارے کاموں سے فارغ ہو کر یوں ہی بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی تبھی اس کی بہن نے اسے موبائل لا کر دیا تھا کہ ''کسی سر کی کال ہے اور آپ کو پوچھ رہے ہیں'' وہ اس کے ہاتھ میں موبائل دے کر چلی گئی تھی اور ردا نے فون کان سے لگا لیا تھا''السلام علیکم میں کعب رحمن بات کر رہا ہوں، آپ ردا میڈم بول رہی ہیں نا''۔''جی میں ردا ہی بات کر رہی ہوں بولیے سر''''میڈم آپ کی کہانیوں کا کام ہو گیا ہے میں نے آپ کو واٹس ایپ پر کہانیاں سینڈ کر دی ہیں آپ چیک کر لیجیے''۔''جی سر شکریہ آپ کا میں چیک کر لیتی ہوں'' کہتے ہوئے اس نے کال ڈسکنکٹ کر دی تھی ۔کعب نے آج کئی مہینوں بعد پھر اسی تلاش گمشدہ نام نہاد محبت کی آواز سنی تھی اور اس کی آواز سُن کر وہ سرشار ہو گیا تھا وہ ردا کی کہانیوں کا کام بہت تیزی سے کر رہا تھا اس نے اپنے سارے کام کو پیچھے کر کے ردا کے کام کو پہلے ترجیح دی تھی اور دن رات اس کے کام میں لگا ہوا تھا اور وہ اب بھی بے خبر تھی انجان تھی کہ کوئی ہے جو اس کی اتنی پرواہ کرتا ہے اس کی چاہت کرتا ہے۔ کہانیوں کے کام کے متعلق ردا دو دن سے اس سے واٹس ایپ پر بات کر رہی تھی وہ بھی بہت مختصر۔ وہ اس سے بہت روڈلی بات کرتی تھی چار پانچ منٹ کے لیے لیکن وہ بیچارہ پھر بھی اس سے بہت عزت سے بات کر رہا تھا۔

آج بھی ردا نے اُسے واٹس ایپ پر میسیج کیا تھا''سر کام ہو گیا کیا''''ہاں میڈم آپ کا کام ہو گیا ہے'' دوسری طرف سے کعب نے میسیج کا ریپلائی کیا تھا،''کتنے پیسے ہو رہے ہیں سر مجھے بول دو میں آپ کے پیسے دے دوں گی''''مجھے آپ سے پیسے نہیں چاہیے''۔''لیکن کیوں سر آپ مجھ سے پیسے کیوں نہیں لینا چاہتے ہیں''''بس یوں ہی''''لیکن میں آپ کو پیسے دوں گی'' اور وہ مسلسل ردا سے پیسے لینے سے انکار کر رہا تھا''سر میں کسی کا احسان نہیں لیتی اور آپ کو پیسے دے کر رہوں گی'' وہ بھی ضد پر اتر آئی تھی اور وہ اس کی ضد کے آگے مان گیا تھا'' ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی''۔سر آپ نے اتنی جلدی میرا کام کر دیا ہے تھوڑا رک کے بھی کرتے تو چلتا اتنا ارجنٹ نہیں تھا ابھی رہنے دینا تھا نا''،''ہم آج کا کام آج ہی کرتے ہیں کل پر نہیں ٹالتے اگر میں کل مر گیا تو آپ کا کام کون کر کے دے گا پھر'' اور وہ اس کے لفظوں پر ساکت رہ گئی تھی۔''آپ ایسا کیوں بول رہے ہو خدا آپ کی لمبی عمر کرے کچھ بھی مت بولا کیجیے سر''''پلیز ردا آپ مجھے سر نہیں کعب بولو''''لیکن میں تو سب کو سر ہی بولتی ہوں''''لیکن مجھے کعب بولو پلیز''''او کے کعب''''ردا''''کعب''''ردا مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے'' کعب کا میسیج پھر موصول ہوا تھا۔''جی بولیں کیا کہنا ہے''۔وہ ردا کی ہمت پا کر بول اٹھا تھا''میں نے آپ کو چھ ماہ پہلے سر فضیل کے آفس میں دیکھا تھا، آپ وہاں آئیں تھی، آپ نے سر کو سلام کیا تھا اور اُن سے باتیں کر رہی تھیں آپ نے حجاب پہنا ہوا تھا میں سر فضیل کے آفس میں ہی بیٹھا ہوا تھا، لیکن آپ کا دھیان مجھ پر نہیں تھا، پھر آپ وہاں سے سامنے بنی کپڑوں کی شاپ میں چلی گئی تھیں میں نے آپ کو فالو بھی کیا تھا، اور بہت پوچھا تھا سر فضیل سے آپ کے بارے میں، میں نے اُن سے کہا بھی تھا کے میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں، لیکن انھوں نے مجھے بولا کہ آپ مجھ سے بات نہیں کریں گی آپ بہت اچھی لڑکی ہیں''۔ وہ حیرت انگیز انکشافات کر رہا تھا اور وہ بت بنی موبائل اسکرین پر ایک کے بعد ایک ابھرنے والے میسیجز کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے کوئی اس کا اس طرح بھی طلبگار ہو سکتا ہے۔''میں نے آپ کو بہت ڈھونڈا تھا، میں نے آپ کو کبھی دیکھا تو نہیں بس آپ کی ایک بار آواز سنی تھی آپ کی خوبصورت آواز مجھے آج بھی یاد ہے لیکن آج آپ مجھے ملیں بھی تو میں کسی اور کا ہو گیا ہوں کاش آپ مجھے دو ماہ پہلے ہی مل جاتی کاش۔ کہاں تھی آپ اتنے دنوں سے کیوں نہیں ملی مجھے کیوں ردا پہلے کیوں نہیں ملی مجھے کیوں''۔ وہ تڑپ رہا تھا اور ردا کا دل اس کے درد پر رو اٹھا تھا۔'' میں آپ کی قسمت میں ہی نہیں تھی کعب اس لیے تو خدا نے آپ کو مجھ سے کبھی نہیں ملایا میرے وجود سے آپ کو ہمیشہ لاعلم رکھا''۔''ردا اب تو میری منگنی بھی ہو چکی ہے اور کچھ عرصہ بعد شادی بھی ہونے جا رہی ہے میں نے زندگی میں جس چیز کو بھی چاہا ہے وہ مجھے نہیں ملی کاش آپ مجھے مل جاتی، مجھے نہیں پتا تھا آپ اتنی اچھی ہو آخر خدا نے میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کیا آخر میں ہی کیوں میں ہی کیوں ردا، بس میری نصیب میں ہی نہیں تھی آپ مجھ سے پہلے کیوں نہیں ملی کیوں، مل جاتی تو کیا ہو جاتا''۔ وہ اس سے تڑپ کر شکوہ کر رہا تھا اور وہ بے بسی سے اس کے میسیجز کو پڑھے جا رہی تھی ردا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اسے کس طرح سمجھائے''اب تو بس درد ہی درد ہے زندگی بھر کے لیے''''ایسا مت بولو کعب آپ بہت خوش رہیں گے میری دعا ہے خدا آپ کو زندگی کی ہر خوشی دے گا کیا ہوا میں جو نہیں ملیں آپ کو آپ کے دل میں موجود میری محبت تو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گی نا یک طرفہ ہی سہی اور میری دعائیں بھی آپ کے ساتھ ہمیشہ رہیں گی''۔ وہ اسے

سمجھا رہی تھی۔ ''میں جانتا ہوں ردا اگر آپ مجھے پہلے بھی مل جاتی تو آپ مجھ سے بات نہیں کرتی تھی کیونکہ میں آپ کے لائق نہیں ہوں آپ بہت قابل ہو'' ''محبت، حسب نسب، امیری غریبی نہیں دیکھتی کعب یہ آپ کی بھول ہے محبت ہر حال میں اپنا آپ منوا کر رہتی ہے، محبت نہ چہروں اور پیسوں سے ہوتی ہے بلکہ محبت تو روح سے ہوتی ہے اور روح کی محبت ہی حقیقی ہوتی ہے کیونکہ روح کی محبت جسم سے جان نکلنے تک ساتھ دیتی ہے ،آپ کو مجھ سے دوستی کی خواہش تھی نا کعب بہت ڈھونڈے تھے نہ مجھے دیکھو خدا نے آپکو مجھ سے ملا ہی دیا ہے اور آپ کی خواہش پوری ہو گئی ہیں اچھا ہوا آپ نے ساری باتیں مجھ سے شیئر کر لیں پتہ نہیں کب سے دل پر بوجھ لیے گھوم رہے تھے۔ اب آپ کا بوجھ کم ہو جائے گا، ایک بار رو لینا کعب اگر نہیں روؤ گے تو ٹوٹ جاؤ گے مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے آپ کے درد پر۔ میں انجانے میں آپ کے دل دکھانے کا سبب بن گئی، مجھے معاف کر دینا کعب مجھے معاف کر دینا''۔ ''ایسا مت بولو ردا آپکی کوئی غلطی نہیں ہے'' ''چلو اداس مت ہووں کعب آج آپ کی خواہش پوری ہو گئی نا مجھ سے بات کرنے کی''۔ ردا نے جھلملاتی آنکھوں سے میسیج ٹائپ کیا تھا۔ '' ردا میں تو آپ سے دوستی کر کے بات کرنا چاہتا تھا''۔ وہ بھی بہت شدت اور تڑپ کے ساتھ کعب کا ایک پھڑکتا ہوا میسیج پھر اسکرین پر چمکا تھا۔

فضا بہت سوگوار تھی، عجیب سا بوجھل پن ماحول میں رچا بسا ہوا تھا۔ اس وقت شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے جب کعب آن لائن آیا تھا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ردا نے کعب سے پوچھا تھا۔ ''اگر میں سچ میں آپ کو مل جاتی تو آپ کیا کرتے تھے'' ''پہلے میں آپ سے دوستی کرتا تھا، آپ کو شادی کے لیے پرپوز کرتا آپ کی فیملی سے ملتا''، ''آپ یہ ساری باتیں کس کے ذریعے کہلواتے تھے'' ''میں ڈائریکٹ آپ کے ارسلان ماموں سے آپ کی رشتے کی بات کرتا اور ہمارا ملنا اور نہ ملنا نصیب کی بات تھی، لیکن میں نے کبھی آپ کے ماموں سے نہیں کہا تھا حالانکہ وہ میرے پاس بہت بار اپنے کام سے آئے تھے اور میرا دل بہت چاہتا تھا ان سے آپ کی خیریت پوچھنے کو''۔ ''اچھا کیا آپ نے ان سے میرا ذکر نہیں کیا، اگر کرتے بھی تو پھر بھی میں آپ کو نہیں مل سکتی تھی، میں ایک سراب ہوں میں راستہ ہوں کسی کی منزل نہیں، آپ مجھ پر چل تو سکتے ہیں لیکن مجھے منزل نہیں بنا سکتے، ہو سکے تو مجھے بھول جانا کعب اور اس کو بہت پیار دینا جس لڑکی سے آپ کی شادی ہو رہی ہے۔ اتنا پیار دینا اسے کہ میں آپ کو کبھی یاد بھی نہ آؤں کیونکہ میں آپ کو یاد آؤں گی تو آپ کو بہت تکلیف ہو گی میں جانتی ہوں آپ مجھے ساری زندگی بھی بھول نہیں سکتے، آپ کے دل میں میری محبت مرتے دم تک آباد رہیں گی'' ردا نے اپنے چہرے پر بہتے آنسوں صاف کیے تھے۔

''ردا میری جان آئی لو یو آئی لو یو'' وہ اظہار محبت کر رہا تھا۔ ''کعب میں آپ کی چاہت کی آپ کی محبت کی بہت قدر اور بہت عزت کرتی ہوں لیکن میں آپ سے محبت نہیں کرتی مجھے آپ سے کبھی محبت ہو بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ میرا دل کھنڈر سیاہ رات کی طرح ہے اس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا میں اپنے دل میں کسی کو نہیں آنے دیتی ہوں میرا دل بنجر ہے جہاں کسی کی بھی محبت کی کونپل نہیں پھوٹ سکتی''۔ '' میں جانتا ہوں ردا کے آپ مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو اور کبھی کرو گی بھی نہیں''۔ ''اچھا کعب ایک بات تو بتاؤ اگر میں حقیقت میں آپ کی بن جاتی تو پھر آپ کیا کرتے''۔ ''پھر میرا ہر لمحہ آپ کے نام ہوتا ردا، میں آپ کو بہت خوش رکھتا، اُس کا محبت سے چور میسیج ملا تھا۔" کیوں نہیں ملی آپ مجھے پہلے کیا ہو جاتا جو پہلے مل جاتی تو''، یہ بات وہ کئی بار کہہ چکا تھا وہ درد دل سے تڑپ رہا تھا اور ردا کی آنکھیں بھیگتی جا رہی تھی بہت دیر تک پھر اس نے اس سے بات کی تھی اور بوجھل دل کے ساتھ اسے اللہ حافظ کہہ کر اجازت دی تھی عجیب داستان محبت تھی کعب کی جو کبھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ سیاہ تاریک رات کے ماتھے پر جھلملاتے ستارے، بہت اداس لگ رہے تھے، پتا نہیں کیوں ردا کو نیند نہیں آ رہی تھیں، اسے کعب سے محبت نہیں تھی مگر ہمدردی ضرور ہو گئی تھی وہ بہت تنہا بہت اکیلا تھا رات کے اس پہر کعب کی باتیں ردا کو بے چین کر رہی تھی بہت دیر بعد نیند کی پری نے اسے اپنی باہوں میں لیا تھا۔

سورج کی گرمی عروج پتی تھی جس سے برا حال ہو رہا تھا۔ ردا ٹھنڈے روم میں بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی موبائل اس کے ہاتھ میں تھا اس نے یونہی موبائل آن کر کے واٹس ایپ چیک کیا تھا کعب آن لائن تھا ردا نے اسے سلام کا میسیج سینڈ کیا تھا دوسری طرف سے کعب نے رپلائی کیا تھا ''الحمدللہ آپ کیسی ہو'' ''میں بھی اچھی ہوں'' کچھ دیر بات کرنے کے بعد پھر کعب کی محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر جوش میں آ گیا تھا، باتیں کرتے کرتے وہ اچانک رو پڑا تھا اور اپنی روتی ہوئی پک لے کے ردا کو سینڈ کی تھی اور پھر ہاتھوں ہاتھ ڈیلیٹ بھی کر دی تھی۔ کعب ابھی آپ نے کیا ڈیلیٹ کیا میں نے دیکھا نہیں پلز پھر سے سینڈ کرو'' ردا نے میسیج کیا تھا'' کچھ نہیں تھا بس میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اس کی پک لے کر آپ کو بھیجی تھی لیکن ڈیلیٹ کر دی کیا کرو گی میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر" اُس نے روتے ہوئے میسیج کیا تھا وہ جانتی تھی دوسری طرف وہ رو رہا ہے۔'' کعب مت روؤں پلیز اپنے آنسو صاف کر لو مجھے تکلیف ہو رہی ہے، میں

نے انجانے میں آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے ہیں وہ بھی عمر بھر کے لیے مجھے اپنے سارے غم دے دواور میری جتنی خوشیاں ہے اپنے پاس رکھ لولیکن میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کوئی خوشی بھی نہیں ہے، میں خود ایک بدنصیب لڑکی ہوں آپ کا نصیب کیا بدلوں گی معاف کر دینا میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی"۔ "نہیں ردا ایسا مت بولو آپ بہت اچھی ہو بہت اچھی بس میرے نصیب میں ہی آپ کا ملنا نہیں تھا کاش آپ میرا نصیب بنتی مجھے مل جاتی"۔وہ ہمیشہ کی طرح وہی جملہ بار بار بول رہا تھا ردا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اُسے کیسے سمجھائے کعب دیکھو آپ کی باتوں نے مجھے بھی رلا دیا میں بھی رو رہی ہوں آپ کے درد پر"۔ارے نہیں ردا آپ کو قسم ہے پلیز روؤں مت آپ کو قسم ہے پلیز، یار تصور کرو شام کا ٹائم ہے ایک بہت خوبصورت سا باغ ہے اور آپ اپنی فیملی کے ساتھ نہر کنارے گھوم رہی ہو"۔" اور آپ مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس باغ میں کہیں کھو گئے ہو"۔"ردا روؤں مت اپنے خوبصورت فیس پر اسمائیل لاؤ پلیز آپ کو قسم ہے یار رونا مت چلے مجھے بہت کام کرنا ہے اپنا خیال رکھنا اور خوش رہنا"۔" آپ میرے خوش رہنے کی دعا کرنا ایک سسکاری ردا کے لبوں سے نکلی تھی"" دعا کروں گا اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے بہت کامیابی دے بہت لمبی عمر عطا کرے اوکے ردا میم صاحبہ اب اجازت دو مجھے کام کرنا ہے۔" وہ اس سے اجازت مانگ رہا تھا،" سنو کعب"" ہاں بولو ردا"" مجھے اپنی شادی میں بلاؤ گے نہ"نہیں ردا میری شادی میں مت آنا پلیز اب زندگی میں کبھی میرے سامنے بھی مت آنا"۔ اس کے میسج میں التجا ریکویسٹ فریاد کیا کچھ نہیں تھا" اچھا سمجھ گئی آپ مجھے اپنی شادی میں کیوں نہیں بلانا چاہتے ہو کیونکہ آپ کو مجھے دیکھ کر بہت تکلیف ہوگی جانتی ہوں جیسے آج تک خدا مجھے آپ کے سامنے نہیں لایا میرے وجود سے ہمیشہ آپ کو لاعلم رکھا ویسے ہی انشاءاللہ میں آپ کے سامنے زندگی بھر بھی نہیں آؤں گی بےفکر رہو آپ میری محبت میری یاد اور باتوں کو بھلا کر اپنی ہم سفر کے ساتھ زندگی انجوائے کرنا اور مجھے بھول جانا، بھول جاؤ گے نا مجھے"۔میں پہلے کوشش کروں گا آپ کو بھولنے کی اور انشاءاللہ پھر دھیرے دھیرے آپ کو بھول بھی جاؤں گا کیونکہ میں روز روز غمزدہ نہیں ہونا چاہتا ہوں میں خوش رہنا چاہتا ہوں'' ''میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آپ کی خوشی میں کامیاب بھی کرے آمین اور آپ بہت خوش رہیں اب ہم بات نہیں کیا کریں گے کعب جب مجھے کام رہے گا بس تبھی بات کیا کروں گی"۔" ہاں ردا جب بھی مجھ سے کوئی کام رہا کرے گا مجھے بھولنا نہیں ہمیشہ آپ کا کام کر کے دوں گا۔"" میں جا رہی ہوں کعب کوشش کرنا مجھے بھولنے کی کیونکہ میں آپ کی تقدیر کبھی نہیں بن سکتی"۔اتنا بول کے وہ آف لائن ہوگئی تھی۔ دوسری طرف کعب اپنے شکستہ قدموں میں نڈھال وجود اور گھائل دل کے ساتھ تڑپ کر رہ گیا تھا۔

ردا کی یاد اسے بہت بےچین و بےقرار کر دیتی تھی اب اس کی یاد کے ساتھ ہی زندگی کا ہر لمحہ جینا تھا کیونکہ وہ اس کی چاہت تھی چاہت بھی انوکھی یک طرفہ اُسے کعب نے کبھی دیکھا نہیں تھا صرف دو تین بار میسج پر ہی بات کی تھی اور ایک دو بار کال پر اس کی آواز سنی تھی وہ آواز جو اس کے لیے آب حیات تھی۔ردا جو اس کی زندگی کے رنگ اپنے ساتھ لے گئی تھی جو اس کی محبت اس کی دیوانگی سے ایک عرصے تک بےخبر رہی تھی اور جب کعب نے اسے خبر کی تو تب تک بہت دیر ہو چکی تھی وہ کسی اور کا ہو گیا تھا ردا وہ راستہ تھی جو کھو گیا تھا اور جو لڑکی اس کا نصیب بننے جا رہی تھی وہ اس کی حقیقی منزل تھی یک طرفہ محبت کے راستے بہت دشوار ہوتے ہیں جن پر پیدل چلتے چلتے انسان تھک جاتا ہے اور وہ بھی تھک گیا تھا۔

رات گہری ہو رہی تھی وہ ابھی تک اپنے آفس میں اداس سا بیٹھا تھا اور مسلسل ردا کو ہی سوچے جا رہا تھا کاش کاش خدایا کیا ہو جاتا جو ردا میری ہمسفر ہوتی کاش وہ بھی مجھ سے محبت کرتی میری محبت یک طرفہ نہ رہتی وہ میری یک طرفہ ادھوری محبت تھی اور مرتے دم تک یک طرفہ ہی رہے گی کیوں کہ میں جانتا ہوں ردا مُجھ سے مر کر بھی محبت نہیں کر سکتی،ایک سسکی کعب رحمن کے لبوں سے نکلی تھی کعب جیسے لڑکے مقدر والوں کا ستارہ بنتے ہیں اور وہ ردا کے مقدر کا ستارہ نہیں بن سکا تھا۔وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا اپنے آفس سے گھر کی طرف جانے والے راستے پر نکل چکا تھا سیاہ رات کے آنچل پر سجے ستارے اُسے روتے ہوئے دیکھ رہے تھے خوشبو لٹاتے پھولوں کی آنکھوں میں بھی اسے دیکھ کر آنسو آ گئے تھے۔ہوا اُداس ہو گئی تھی۔بہت دور فضا میں کوئل کی پرسوز آواز گونج رہی تھی، اور سیاہ سڑک پر کعب رحمٰن کی گاڑی تیزی سے دوڑتی چلی جا رہی تھی اور راستے ایک بار پھر اس کے ہم سفر بن گئے تھے۔

□□□

Rubina Sagar Rubi
D/o:Shaikh Bilal Sagar
Hirapura
Near Masjid Darussalam
Achalpur City
Distt: Amravati-444806 (M.S)

دہی کی گجیات

اجزا: اُردوال دوکپ، زیرہ ایک چائے کا چمچہ، سونف کالی مرچ آدھا چائے کا چمچہ، کاجو 15 تا 20 عدد، کشمش دو کھانے کے چمچے، نمک حسب ذائقہ، تیل حسب ضرورت، دہی چھ کپ، بھنا اور پسا ہوا زیرہ، لال مرچ ایک ایک چائے کا چمچہ / ہرا دھنیا، ادرک کے باریک ٹکڑے اور املی کی چٹنی سجاوٹ کیلئے حسب ضرورت

تیار کرنے کی ترکیب: اُردوال زیادہ پانی میں چھ گھنٹے تک بھگو دیں۔ اسے پیس کر پیسٹ بنالیں۔ پھر اس میں زیرہ سونف اور نمک ڈالیں اور اچھی طرح ملالیں۔ کاجو اور کشمش کاٹ لیں۔ پھر اچھی طرح ملالیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ ایک پلاسٹک شیٹ پر دال کے آمیزہ سے بھرہوا ایک چمچہ انڈیلیں۔ آمیزہ کو ڈھائی انچ قطر کے دائرے میں پھیلادیں۔ کاجو اور کشمش سے بھرا ہوا چائے کا چمچ درمیان میں رکھیں۔ پلاسٹک شیٹ کے دو اوپر کے کونوں کو پکڑیں اور اپنی طرف کر دوسرے دو کونوں سے ملادیں۔ پھر اس سے آمیزہ ہلال کی شکل اختیار کرے گا پھر گجیا کو آہستہ آہستہ گرم تیل میں ڈالیں۔ گجیا کو ڈیپ فرائی کریں یہاں تک کہ اس کا رنگ سنہرا بھورا ہوجائے۔ پھر گرم پانی میں ڈبو دیں۔ دہی کو پھینٹ لیں اور نمک ڈال لیں۔ جیا کو نچوڑ کر دہی میں ڈالیں۔ پیش کرنے سے قبل بھنا اور پسا ہوا زیرہ سرخ مرچ، دھنیے کے پتے اور ادرک ڈالیں۔ اوپر کی چٹنی ڈال کر پیش کریں۔

کیسر والے پنیر کوفتے

اجزا: اجزائے ترکیبی برائے کوفتے: 2 عدد ڈبل روٹی کے توس۔ 1 کپ پنیر (کاٹج پنیر) کدوکش کردہ۔ 1 کپ آلو ابلے ہوئے چھلے ہوئے۔ 1 چائے کا چمچ ادرک کدوکش کردہ۔ 1 کھانے کا چمچ کاجو کٹے ہوئے۔ 1 چائے کا چمچ پسی ہوئی سرخ مرچ۔ نمک حسبِ ذائقہ۔ 2 تا 3 کھانے کے چمچ میدہ برائے کوٹنگ (تہہ جمانے کے لیے)۔

دیگر اجزائے ترکیبی: 1 کپ پیاز کٹے ہوئے۔

1 کھانے کا چمچ ادرک کٹا ہوا۔ 1 عدد سالم خشک سرخ مرچ ٹکڑوں میں کٹی ہوئی۔ 2 کھانے کے چمچ گھی۔ 2 عدد پتے تیز پات / تیج پات۔ 2 تا 3 الائچی۔ 2 کھانے کے چمچ کاجو پسے ہوئے۔ 1 کپ دودھ 1 کپ پانی میں تحلیل کردہ۔ 1 کپ تازہ دہی پھینٹی ہوئی۔ نمک حسبِ ذائقہ۔

چند تاریں زعفران (کیسر) 2 کھانے کے چمچ دودھ میں تحلیل کردہ۔1 چائے کا چمچ پنجابی گرم مسالہ۔1 کپ تازہ کریم۔1 چائے کا چمچ پسی ہوئی سرخ مرچ۔

تیار کرنے کی ترکیب: تیاری برائے کوفتے

ڈبل روٹی کی سائیڈیں کاٹ لیں اور انھیں علیحدہ رکھ دیں۔ ڈبل روٹی کے توس پانی میں بھگوئیں۔ انھیں پانی سے نکال کر بخوبی نچوڑ لیں تا کہ ان میں سے تمام پانی نکل جائے۔4 ماسوائے میدہ دیگر تمام اجزائے ترکیبی ڈبل روٹی میں شامل کریں۔ انھیں بخوبی یکجا کریں۔ مکسچر کو 12 مساوی حصوں میں تقسیم کریں۔ ہر ایک حصے کو گول کوفتے کی شکل دیں۔ ہر ایک کوفتے کو میدہ میں رول (Roll) کریں تا کہ ان پر مساوی اور ہموار انداز میں میدہ کی تہہ جم جائے۔ ایک کڑاہی میں آئل گرم کریں۔ آئل میں کوفتے ڈیپ فرائی کریں حتیٰ کہ وہ سنہری براؤن رنگت کے حامل بن جائیں۔ انھیں آئل جذب کرنے والے کاغذ پر نچوڑ لیں اور ایک جانب رکھ دیں۔

کیسے روبہ عمل ہونا ہے

پیاز۔ ادرک۔ اور سرخ مرچ کو باہم یکجا کریں۔ انھیں ایک مکسر میں بلینڈ کر کے ایک ہموار پیسٹ بنا لیں اور ایک جانب رکھ دیں۔ ایک کڑاہی میں گھی گرم کریں۔ اس میں تیز پات/ تیج پات اور الائچی شامل کریں۔10 سیکنڈ تک انھیں بھونیں۔ تیار شدہ پیسٹ شامل کریں۔ دھیمی آنچ پر بھونیں حتیٰ کہ پیاز سنہری براؤن رنگت کے حامل بن جائیں۔ پسے ہوئے کاجو۔ دہی اور نمک شامل کریں۔ دھیمی آنچ پر اس وقت تک ابلنے کے قریب پڑا رہنے دیں حتیٰ کہ گریوی (شوربہ) گاڑھی بن جائے۔ زعفران مکسچر۔ پنجابی گرم مسالہ۔ تازہ کریم۔ اور پسی ہوئی سرخ مرچ شامل کریں اور 1 تا 2 منٹ تک ابلنے کے قریب آگ پر پڑا رہنے دیں۔ گرما گرم گریوی (شوربہ) کوفتوں کے اوپر انڈیلیں۔ فی الفور کھانے کے لیے پیش کر دیں

استفڈ بینگن

اجزا: بینگن (بڑے سائز کا) ایک عدد، جھینگے 200 گرام، چکن ڈرم اسٹکز دو عدد، نمک حسب ذائقہ، لہسن کے جوئے تین سے چار عدد، ادرک ایک انچ کا ٹکڑا، پیاز ایک عدد، ٹماٹر دو عدد، پسی ہوئی لال مرچ ایک چائے کا چمچ، ہلدی آدھا چائے کا چمچ، کالی مرچ پسی ہوئی آدھا چائے کا چمچ، لیموں کا رس ایک کھانے کا چمچ، سویا ساس ایک کھانے کا چمچ، چلی ساس ایک کھانے کا چمچ، چیڈر چیز آدھی پیالی، کوکنگ آئل چار کھانے کے چمچ

تیار کرنے کی ترکیب

بینگن کو صاف دھو کر اُبلتے ہوئے پانی میں دس سے بارہ منٹ اُبالیں پھر اوپر سے (چوڑائی کے رخ پر) قتلہ کاٹیں اور اس پر نمک اور لیموں کا رس چھڑک دیں (تا کہ رنگت کھلی رہے)۔ چکن کو نمک، کالی مرچ اور کچلا ہوا ادرک لگا کر ہلکی آنچ پر پکا کر گلا لیں، سویا ساس ملا کر چولہے سے اُتاریں اور ہڈی علیحدہ کر لیں۔

جھینگوں کو صاف دھو کر کچلا ہوا لہسن، نمک اور چلی ساس لگا کر ایک کھانے کے چمچ کوکنگ آئل میں فرائی کر کے نکال لیں۔ نوکدار چھری سے احتیاط سے بینگن کا گودا نکال کر چوپ کر لیں۔ ساتھ ہی پیاز اور ٹماٹر کو بھی چوپ کر کے کوکنگ آئل میں نرم ہونے تک فرائی کریں۔

پھر اس میں نمک، ہلدی اور لال مرچ ڈال کر بھونیں، اس میں جھینگے اور چکن ڈال کر ملائیں اور چولہے سے اُتار لیں۔ اس مکسچر کو بینگن میں بھر کر اوپر سے کش کیا ہوا چیز ڈالیں اور پہلے سے گرم کیے ہوئے اوون میں گرل جلا کر اتنی دیر رکھیں کہ چیز پگھل جائے۔۔ بینگن کی اس مزیدار ڈش کو اُبلے ہوئے چاولوں کے ساتھ انجوائے کریں۔

(بحوالہ www.urdupoint.com)

شکیل احمد

غذا کی صفائی اور تحفظ

غذا کو حفاظت کے ساتھ رکھنا بہت ضروری ہے۔ اناج کو صاف گوداموں میں مناسب جگہ پر رکھنا چاہیے چوہے، کیڑے، گھن، پھپھوندی، جالا، جراثیم اناج کے دشمن ہیں جو بھی اناج کو خراب کر دیتے ہیں۔ خراب اناج کو استعمال کرنے سے جراثیم انسان کے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں جس سے مختلف بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح پکے کھانے کے خراب ہونے کے امکانات بھی ہوتے ہیں اس لیے غذا کو محفوظ رکھنے کے لیے اقدامات کرنا ضروری ہوتا ہے۔

غذا کو محفوظ رکھنے کے لیے سب سے پہلی شرط صفائی ہے۔ یہ غذا کی خرابی کے ذمہ دار جراثیم وغیرہ کو اس سے دور کرتی ہے۔ غذاؤں میں غذائیت کی مقدار سے ان کے اندر جراثیم اور کیڑے لگتے ہیں۔ اس لیے ہر غذا کی حفاظت کے طریقے الگ ہیں۔ غذا کو کس درجہ حرارت پر رکھا جائے کہ وہ محفوظ رہے ان تمام باتوں کو معلوم کرنا ضروری ہے۔ ذیل میں چند اہم غذاؤں کی حفاظت کے طریقے درج ہیں۔

دودھ: جانور سے دودھ نکال کر برتن میں دیر تک پڑے رہنے سے اس میں جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور وٹامن کی کمی ہو جاتی ہے۔ اس لیے دودھ نکالنے کے بعد اس کو فوراً ابال لینا چاہیے یا ریفریجریٹر کے ٹھنڈے حصہ میں رکھ دینا چاہیے۔ دودھ ہمیشہ صاف برتن میں ڈھک کر رکھنا چاہیے۔ بہتر ہے کہ اس کو ٹھنڈی جگہ رکھیں۔ بو باس والی چیزوں جیسے مچھلی، پیاز، کرم کلہ وغیرہ سے دور رکھنا چاہیے۔ باسی دودھ کو تازے دودھ میں نہیں ملانا چاہیے اس سے تمام دودھ خراب ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ دودھ کے تحفظ کے مندرجہ ذیل طریقے ہیں۔

(1) ابالنا۔ عموماً ہندوستانی گھروں میں یہی طریقہ مستعمل ہے۔ ابلا دودھ آہستہ آہستہ جمتا ہے اور وہ اشیا جو شیری تیزاب (Lactic Acid) بناتی ہیں ابالنے سے کم ہو جاتی ہیں۔ مرض کے ذمے دار جراثیم کے اسپور (تخم) ابالنے سے ختم ہوتے ہیں۔ دودھ اگر کھلے برتن میں ابالا جائے تو ایک پتلی بالائی کی تہہ جس میں دودھ کی چربی، چونے کے نمک Calcium Salts، کچھ خشک کیسین اور جما ہوا لیکٹ ایلبومین ہوتا ہے، دودھ کے اوپر جم جاتی ہے۔ دودھ کو ابالنے سے مندرجہ ذیل تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

(1) دودھ کی پروٹین میں تبدیلی ہوتی ہے۔ لیکٹ ایلبومین اور لیکٹ گلوبلین دونوں علی الترتیب 160ºF اور 168ºF پر جم جاتی ہیں۔ کیسنیوجن زیادہ قابل ہضم بن جاتا ہے۔

(2) محلول چربی اکٹھی ہو جاتی ہے۔

(3) معدنی نمک کیلیم، فاسفورس اور میگنیشیم ترسیب شدہ (Preci-pitated) ہو جاتے ہیں اور Oitrate کا ایک حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔

(4) وٹامن سی وٹامن بی کا بھی کچھ حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔

(5) انزائم اور جرائم ختم ہو جاتے ہیں۔

(6) کاربن ڈائی آکسائڈ باہر نکل جاتی ہے اور قند سیر لیکوس

(Lactose) 212° F) کے اوپر جل جاتی ہے۔

(2) اتلاف جراثیم: اس میں دودھ کو 100°C تک گرم کر کے 15 منٹ تک اسی درجۂ حرارت پر یک بند جراثیم سے پاک برتن میں رکھتے ہیں۔ اس سے تمام جراثیم اور ان کے اندر Sporbs ختم ہو جاتے ہیں لیکن اس میں نقصان یہ ہے کہ وٹامن سی اور بی، علی الترتیب اپنی پہلی مقدار کے آدھے اور ایک تہائی رہ جاتے ہیں۔ پروٹین کی حیاتیاتی قیمت (Bilogical Value) بھی کچھ کم ہو جاتی ہے۔ نوزائیدہ بچوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔

(3) پاسچری ڈھنگ سے تطہیر۔ فرانسیسی سائنس داں، موئس پاسچر کے ذریعہ شراب کو کھٹا ہونے سے بچانے کے لیے دریافت کردہ حرارتی طریقہ، دودھ کی حفاظت کے لیے بہترین ثابت ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے معیادی بخاری، ہیضہ، تپ دق، پیچس وغیرہ کے جراثیم ختم ہو جاتے ہیں اس طریقہ میں دودھ کو 145° F سے 150°F تک آدھ گھنٹہ گرم کر کے ایک دم 550°F تک ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ اس طریقہ سے نہ انزائم ضائع ہوتے ہیں نہ دودھ کا رنگ، ذائقہ، خوشبو اور حیاتیاتی قیمت تبدیل ہوتی ہے۔ وٹامن سی جو 125°F پر ضائع ہو جاتا ہے اس کو چھوڑ کر تمام وٹامن برقرار رہتے ہیں۔ پاسچری طریقۂ تطہیر کے کچھ اپنے نقصانات بھی ہیں۔ جراثیم کو ختم کرنے کے باوجود یہ مواد سامہ (Toxin) پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس طریقہ کی وجہ سے باسی دودھ بازار میں فروخت ہوتا ہے، جس سے صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ لیکٹک ایسڈ عصیہ Lactic Acid Bacilius جو دوسرے جراثیم کے بڑھنے کو روکتا ہے اس میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اس طرح دودھ کو دیر تک رکھنے سے اس میں مضرت رساں اجزا پیدا ہو جاتے ہیں۔

(4) دودھ کا خشک کرنا یا تجفیف (Drying odesiccation)
اس میں دودھ کو گرم بیلنوں پر گزارتے ہیں جہاں اس کی تبخیر ہوتی ہے اور ایک باریک جھلی بن جاتی ہے جس کو کھرچ کر الگ کرتے ہیں اور چھلنی میں چھان لیتے ہیں جس سے بہت باریک سفوف بن جاتا ہے۔ اس سفوف سے جو دودھ بنتا ہے وہ یکساں اجزا ترکیبی رکھتا ہے یہ تمام خطرناک جراثیم سے پاک ہوتا ہے اور اسے بچے آسانی سے ہضم کر لیتے ہیں۔ البتہ اس میں وٹامن سی بہت کم ہو جاتا ہے اس لیے جب بچوں کو یہ دودھ دیا جائے تو ساتھ میں نارنگی کا عرق یا وٹامن سی کی کوئی غذا خوارک میں ضرور شامل کرنا چاہیے۔

(5) بستہ دودھ (Condensed Milk): پاسچری عمل کر کے دودھ کو آہستہ آہستہ کڑھاؤں میں پکایا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا حجم تازہ دودھ کا ایک چوتھائی رہ جائے۔ اس کو ڈبوں میں بند کر لیا جاتا ہے اور ان جگہوں پر جہاں تازہ دودھ دستیاب نہیں ہے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ چار قسم کا ہوتا ہے۔

	دودھ کی چکنائی کی مقدار	دودھ کے ٹھوس کی مقدار
1۔ مکمل کریم والا دودھ (پھیکا)	9.0%	31.0%
2۔ 〃 〃 (میٹھا)	9.0%	38.0%

3۔بالائی اترا دودھ (پھیکی)	20.0%
4۔بالائی اترا دودھ (میٹھا)	26.06

بالائی اترا دودھ (میٹھا یا پھیکا) بچوں کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

(6) دودھ میں کیمیائی اشیا کی آمیزش، دودھ کے تحفظ کے لیے مستعمل جراثیم کش (Antiseptic) عموماً صفصاف کا تیزاب (Salictlic Aciad) سہاگے کا تیزاب (Boricacid) سہاگہ (Dorox) سلفیورس ایسڈ۔ فارملین اور ہائیڈروجن پر آکسائیڈ ہیں۔ ان کا استعمال آج کل قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔

کیمیاوی طریقہ

کبھی کبھی کچھ کیمیاوی اجزا ملا کر غذا کو محفوظ رکھا جاتا ہے لیکن اس طریقے سے حتی الامکان احتراز کرنا مناسب ہے۔ عام طور پر مستعمل کیمیاوی محافظ سہاگے کا تیزاب (Boric Acid) لوبانی تیزاب (Bezoic Acid) فارمیلین (Formal Dehtde) صفصاف کا تیزاب (Galicylic Acid) توتیا (کاپر سلفیٹ) کھانے کا سوڈا (سوڈا بائیکارب) سنکھیا (آرسنک) چلی کا شورہ (NA, N, 03) اور شورہ (KNO3) ہیں۔

انڈے

انڈوں کے خراب ہونے سے محفوظ رکھنے کے لیے سب سے بہتر جگہ ریفریجریٹر ہیں۔ان میں رکھنے سے انڈوں میں تازگی برقرار رہتی ہے۔ ان کو کسی اور جگہ جیسے مکان یا اسٹور میں رکھنا غلطی ہے۔انڈوں کو رکھنے سے قبل پانی سے دھونا نہیں چاہیے۔دھونے سے اوپر کی ایک پتلی جھلی جو ہوا اور بو کو روکتی ہے ضائع ہو جاتی ہے جس سے انڈا جلد خراب ہو جاتا ہے۔انڈا صرف استعمال کرتے وقت دھونا چاہیے۔

مکھن اور مارگرین

روشنی سے کچھ وٹامن اسے ضائع ہو جاتا ہے۔اس لیے مکھن اور مارگرین کو ڈھک کر صاف اور ٹھنڈی جگہ رکھنا چاہیے۔ان کو کھانے کی میز پر ضرورت سے زیادہ دیر تک نہیں پڑے رہنے دینا چاہیے۔

ترکاریاں

سبزیاں ہمیشہ تازی استعمال کرنا چاہیے۔تازی سبزیاں ذائقہ دار ہوتی ہیں اور ان میں وٹامن زیادہ ہوتے ہیں۔ سلاد بنانے کے لیے ترکاریوں کو پھیلا کر رکھنا چاہیے، سبزیوں کو دبا کر رکھنے سے وہ ٹوٹ کر خراب ہو جاتی ہیں اور ان کا عرق ضائع ہو جاتا ہے۔سبزیاں ہمیشہ ٹھنڈی جگہ رکھنا چاہیے۔سوکھنے سے سبزویوں کے مفید اجزا ضائع ہو جاتے ہیں زیادہ مقدار میں اور زیادہ عرصہ تک سبزیوں اور پھلوں کو رکھنے کے لیے آج کل ٹھنڈے کمرے (Cold Storage) استعمال ہوتے ہیں۔ تاجر پھلوں اور سبزیوں کو ان میں جمع کر دیتے ہیں جس سے وہ خراب نہیں ہونے پاتیں۔

(ہماری غذا، شکیل احمد، قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، سنہ اشاعت 1982)

حسن کی نگہداشت

پپیتا مردہ جلد سے نجات دلانے میں مدد کرتا ہے

پپیتا، جس میں پیپین نامی قدرتی انزائم ہوتا ہے، قدرتی طور پر جلد کو صاف کرتا ہے، جس سے یہ ہموار اور مخملی رہتی ہے۔ چونکہ کچے پپیتے میں زیادہ پاپین ہوتے ہیں، آپ اسے نرمی سے نکالنے اور جلد کے مردہ خلیات اور دیگر نجاست کو دور کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ حساس جلد والے لوگ بھی پپیتا استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ اس سے الرجی کا امکان کم ہوتا ہے۔ 41 کپ پپیتے کا گوشت، 1 چمچ تازہ انناس کے ساتھ ملا کر ایک ہموار مرکب تیار کریں یکساں طور پر لگائیں اور کلی کرنے سے پہلے 5 سے 15 منٹ تک بیٹھنے دیں۔

ٹماٹر جلد سے اضافی تیل کو کم کرنے کے لیے

چہرے پر ضرورت سے زیادہ تیل صرف تیل والی جلد والے افراد کو متاثر نہیں کرتا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں موسم زیادہ تر مرطوب ہوتا ہے، ضرورت سے زیادہ تیل کا استعمال ہوتا ہے۔ ٹماٹر جس میں لائکوپین کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، ان میں اینٹی آکسیڈنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈک اور تیز اثرات بھی ہوتے ہیں۔ یہ جلد کے قدرتی تیل کو متوازن کرتا ہے اور کسی بھی اضافی تیل کو ہٹاتا ہے جس کا آپ کو سامنا ہو سکتا ہے۔ چہرے کی خوبصورتی کا یہ قدرتی ٹوٹکہ جھریوں اور باریک لکیروں کی ظاہری شکل کو کم کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک ٹماٹر کا گودا نکال کر چہرے پر یکساں طور پر لگائیں۔ قدرتی طور پر چمکدار جلد کو ظاہر کرنے کے لیے اسے گرم پانی سے اتارنے سے پہلے اسے 15 منٹ تک خشک ہونے دیں۔

چنے کا آٹا ٹین کو کم کرنے میں مدد کرتا ہے

چنے کا آٹا، جسے ہم میں سے اکثر بیسن کے نام سے جانتے ہیں، جلد کے مردہ خلیات، ٹین اور دھوپ کے جلنے کو دور کرنے کے لیے قدرتی، اعتدال پسند ایکسفولینٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ صاف، ہموار اور قدرتی طور پر چمکتی ہوئی جلد چاہتے ہیں تو آپ کو یہ جاننا چاہیے کہ چہرے کی خوبصورتی کا ایک قدرتی ٹوٹکہ یہ ہے۔ ایک مکسنگ بیسن میں چنے کا آٹا اور دہی کے برابر حصوں کو ملا کر پیسٹ بنائیں۔ اس پیسٹ کو اپنے چہرے اور گردن پر یکساں طور پر لگائیں اور پانی سے دھونے سے پہلے 30 منٹ تک لگا رہنے دیں۔ یہ نرمی سے جلد کے مردہ خلیات اور گہرے جمے ہوئے گرائم کو ہٹا دے گا، آپ کی جلد کے رنگ کو ہلکا اور برابر کر دے گا۔

شہد چمکتی ہوئی جلد کو حاصل کرنے میں مدد کر سکتا ہے

ہم سب جانتے ہیں کہ شہد کے متعدد صحت کے فوائد ہیں اور یہ صاف جلد کے لیے ایک بہترین کاسمیٹک ٹپ ہے۔ ہر روز اپنے چہرے پر تھوڑی مقدار میں شہد لگانا صحت مند، چمکدار جلد حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ شہد کی جذب کرنے والی خصوصیات جلد کے چھیدوں سے آلودگی نکالتی ہیں اور آپ کی جلد کو مکمل طور پر صاف کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ شہد کے اینٹی بیکٹیریل اثرات مہاسوں کو ٹھیک اور روکتے ہیں۔ شہد کی اینٹی مائکروبیل خصوصیات جلد کی جلن کو دور کرتی ہیں اور جلد کو بیکٹیریل انفیکشن سے بچاتی ہیں۔ شہد، نمایاں نمی بخش اثرات رکھتا ہے اور یہ خشک جلد کے لیے بھی ایک لاجواب راحت ہے۔

https//:www.femina.in/

تاثرات: نگر نگر سے

ماہنامہ 'خواتین دنیا' کا شمارہ جون 2022 نظرنواز ہوا۔ نسائی ادب میں 'خواتین دنیا' اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے مضامین کے متعلق یہی کہونگا۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است' میں صرف ''اردو صحافت اور خواتین'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔ ڈاکٹر عرشیہ جبین نے محمدی بیگم کی ادبی وصحافتی خدمات'' کا مفصل جائزہ پیش کیا ہے۔ مبارکباد کے قابل ہیں۔ دوسرا مضمون 'اردو میں تانیثی صحافت' محترم حقانی القاسمی صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ یہ ایک نیا موضوع ہے۔

موصوف نے فیمینزم کے بارے میں صحیح لکھا ہے۔ صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ اردو میں تانیثی صحافت کا وجود ہی نہیں ہے خاص طور پر ریڈیکل فیمینزم مشرقی تصورات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ فیمینزم نے خانگی اقدار سے بیگانگی اور تحریک آزادی نسواں کی آڑ میں عورتوں کو مستحکم اور خودمختار بنانے کے نام پر عورتوں کے جسم اور ذہن کی تجارت کی ہے۔ فیمینزم نے عورت کے چہرے اور چرتر کو مکمل طور پر مسخ کردیا ہے۔24

موصوف نے فیمینزم اور آزادی نسواں کے پیغام کو دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے اور ساری حقیقت اور کہانی بیان کردی ہے لیکن میں تو اسے داستان کہوں گا۔ گویا یہ فیمینزم کا ماحصل، رس اور درس ہے۔ اس میں بڑی سچائی اور حقیقت پوشیدہ ہے۔ ہر لفظ معنی ومفہوم ماضی وحال کی عکاسی کرتا ہے۔ واقعات تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے نظر نواز ہوتے ہیں اور فیمینزم (مغربی تانیثیت) آشکارہ ہوجاتی ہے۔

اس نئے عنوان کے ساتھ بیش بہا معلومات نظرنواز ہوئی۔ ہر لفظ معنی ومفہوم' ماضی اور حال کی عکاسی کرتا ہے۔ واقعات تسلسل کے ساتھ نظرنواز ہوتے ہیں اور مغربی تانیثیت کی حقیقت آشکارہ ہوجاتی ہے۔ محترم حقانی القاسمی صاحب کو سلام اور مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، اورنگ آباد، مہاراشٹر

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شریمد بھگوت گیتا

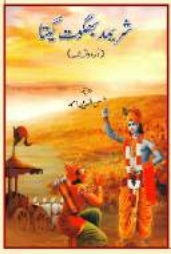

مترجم: حسن الدین احمد

پانچویں طباعت: 2021

صفحات: 105

قیمت 80 روپے

دارا شکوہ: آثار و افکار

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 234

قیمت: 150 روپے

الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمہ داریاں

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 182

قیمت: 110 روپے

شاد عظیم آبادی

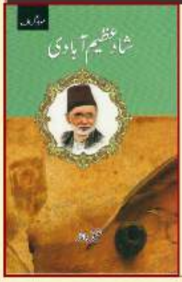

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 156

قیمت: 95 روپے

الف لیلہ و لیلہ (جلد اوّل تا ہفتم)

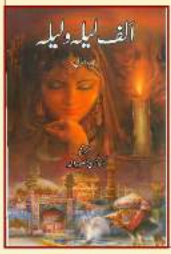

مترجم: ابوالحسن منصور احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 368 (جلد اوّل)، 455 (دوم)

429 (سوم)، 347 (چہارم)، 314 پنجم

313 (ششم)، 223 (ہفتم)

قیمت 1185 روپے (مکمل سیٹ)

اصول طب

مصنف: سید کمال الدین حسین ہمدانی

ساتویں طباعت: 2022

صفحات: 598

قیمت: 160 روپے

کلاسیکی اور عصری سماجیاتی نظریے

مصنف: عذرا عابدی

پہلی اشاعت:: 2021

صفحات: 446

قیمت: 205 روپے

خلجی خاندان

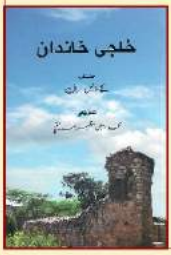

مصنف: کے ایس لال

مترجم: محمد یٰسین مظہر صدیقی

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 481، قیمت: 220 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, अगस्त - २०२२ वर्ष: ६, अंक: ८
Mahnama Khawateen Duniya Monthly August 2022, Vol.6 , Issue: 8
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-08-2022
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6